TIGHT BINDING BOOK

TEXT CUT WITHIN THE BOOK ONLY

188380

OUP—391—29-4-72—10,000 Checked 1975

OSMANIA UNIVERSITY LIBRARY

Call No. ۹۲۸۶۹۱ ظ۳ Accession No. U 3557

Author ظہیر الدین ٹالب

Title محمد اقبال

This book should be returned on or before the date last marked below.

سوانح اقبال

نور اللہ مرقدہ

مؤلفہ

حضرت طالب فارسی لکھنوی

طابع و ناشر
مہتمم اشاعت ادب لاہور

حقوقِ طباعت بحق طابع وناشر محفوظ ہیں۔

سرودِ رفتہ باز آید کہ ناید ۔ نسیمے از حجاز آید کہ ناید
سرآمد روزگارے ایں فقیرے ۔ دگر دانائے راز آید کہ ناید

ترجمانِ حقیقت علامہ ۔ ڈاکٹر سر

محمد اقبال

کی

مفصل و مکمل

سوانح عمری

مؤلفہ

مولانا محمد ظہیر الدین صاحب طالب فارسی لکھنوی

طابع و ناشر

مہتمم اشاعت ادب لاہور

فیروز سٹریٹ بیرون شیرانوالہ دروازہ

قیمت قسم اوّل دعہ ۔ قسم دوم ۱عہ

دُنیائے ادب میں ایک بہترین اضافہ

رُوحِ ادب

یعنی

مُرقّعِ مُصنّفینِ ہند

اِس کتاب میں ہندوستان کے مشہور و معروف مصنفین سر سید۔ مولانا محمد حسین آزاد۔ ڈپٹی نذیر احمد دہلوی مولانا ذکاء اللہ۔ علامہ راشد الخیری۔ پنڈت رتن ناتھ سرشار۔ ابو الکلام آزاد۔ مولانا عبد الحلیم شرر۔ سدرشن۔ سید سجاد حیدر۔ مولانا شبلی نعمانی۔ سر عبد القادر۔ سید سلیمان ندوی۔ منشی پریم چند مولوی عبد الحق۔ مولوی بشیر احمد دہلوی۔ نیاز فتحپوری۔ خواجہ حسن نظامی۔ سجاد مرزا بیگ دہلوی سید عمر حسنی۔ غلام دستگیر نامی۔ مرزا غالب۔ حضرت ذوق۔ امیر مینائی۔ مرزا داغ مولانا حالی۔ سر اقبال۔ مولانا ظفر علی خاں۔ اکبر الہ آبادی۔ جوش ملیح آبادی حفیظ جالندھری کے مفصل حالاتِ زندگی درج ہیں۔ اگر آپ اِن معزز ترین ہستیوں کے حالات سے بہرہ اندوز ہونا چاہتے ہیں۔ تو صرف سوا پانچ آنہ (۵/۱) کے ٹکٹ (جو ہماری محنت و لاگت کے مقابلہ میں ذرہ کے برابر بھی نہیں ہیں) پیشگی بھیج کر کتاب مرقع مصنفین ہند طلب فرمایئے۔ اور اپنی معلومات میں اضافہ کیجئے۔ علم دوست حضرات کے لئے یہ کتاب ایک بے نظیر تحفہ ہے۔

نوٹ :۔ اگر بارِ خاطر نہ ہو۔ تو اپنے علم دوست احباب کے مکمل پتے بھی خوشخط لکھ کر ارسال فرمائیں۔ ہم آپ کی اِس نوازشِ خصوصی کے شکر گزار ہوں گے۔ منگانے کا پتہ :۔

مہتمم اشاعتِ ادب لاہور

CHECKED 1965

فہرست مضامین

نمبر	نام	صفحہ
۱	دیباچہ	۵
۲	سوانح اقبال ...	۷
۳	ابتدائی تعلیم	۹
۴	شاعری کا آغاز...	۹
۵	لاہور کے مشاعروں میں شرکت	۱۳
۶	ہمالہ	۱۴
۷	پبلک طور پر شاعری کا آغاز	۱۸
۸	فارسی گوئی کی ابتداء	۲۰
۹	ترکا خطاب	۲۳
۱۰	میسور، مدراس، حیدرآباد دکن کا سفر	۲۵
۱۱	اقبال اور پنجاب کونسل...	۲۷
۱۲	کشمیر اور اقبال....	۳۴
۱۳	اقبال اور سیاست	۳۶
۱۴	شاعر اسلام	۴۹
۱۵	اقبال کی ایک غیر معروف رباعی	۵۲
۱۶	ضرب کلیم	۵۴
۱۷	مصلح قوم	۶۲
۱۸	اقبال کا ایک خط...	۶۸
۱۹	شمس العلماء میر حسن مرحوم	۸۴
۲۰	اقبال کی شخصیت ...	۹۰
۲۱	سر تیج بہادر سپرو کا پیغام	۱۰۷
۲۲	مرض الموت	۱۰۸
۲۳	آخری ارشادات	۱۱۳
۲۴	مدفن کے مقام کا فیصلہ	۱۱۴
۲۵	حضرت علامہ کی اولاد...	۱۱۹
۲۶	جنازے کی روانگی...	۱۱۹
۲۷	نماز جنازہ	۱۲۱
۲۸	اقبال کا آخری قطعہ...	۱۲۲
۲۹	دخل در معقولات کا جواب	۱۲۳

اطلاع ضروری

اشاعتِ ادب لاہور

کی مکمل فہرست کتب پانچ پیسے
کے ٹکٹ آنے پر روانہ کیجاتی
ہے

جواب طلب امور کے لئے جوابی کارڈ
آنا چاہیئے

دیباچہ

اسلاف کی روایات سے روگردانی ابتدا سے ہماری قوم کا وطیرہ رہا ہے۔ یہی وجہ ہے۔ کہ آج ہماری دنیا کا اُفق تیرہ و تاریک گھٹاؤں سے محصور نظر آتا ہے۔ اور احساسات کی دنیا پر بے حسی کی موت طاری ہے۔ تیرہ سو سال میں اسلام نے ایک انسان پیدا کیا جس نے اپنے پُر کیف نغموں سے قوم کی مردہ قوتوں میں زندگی کی برقی لہر دوڑا دی۔ یہ نخلِ طوبیٰ کا طائر اقبال تھا۔ جو ہماری ناکارہ ہستیوں پر افسوس کرتے کرتے عالمِ فانی سے عالمِ جاودانی کی طرف پرواز کر گیا۔ وہ آج ہماری نظروں سے پوشیدہ ہے۔ لیکن اس کا "پیغام زندگی" موجود ہے۔ اور ہمیشہ موجود رہیگا۔

زندہ قوموں کا اصول ہے۔ کہ وہ معزز افراد کے واقعاتِ زندگی قلمبند کرنے میں کوتاہی نہیں کرتیں۔ ان واقعات کو محفوظ کرنے سے ان کی آئندہ نسلیں منزلِ حیات میں کامیاب و کامران ثابت ہوتی ہیں۔ لیکن یہ اُن قوموں کا ذکر ہے۔ جو زندگی کے مقاصد کی تکمیل میں ہر وقت سرگرم ہوتی ہیں۔ یہی سرگرمی اور زندگی شاعرِ اسلام اقبال نے بھی پیکرِ اسلام میں پیدا کی ہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہے۔ کہ اقبال کی آنکھ بند ہونے سے پہلے ہی ملک کے ہر گوشہ سے تقاضا ہونے لگا۔ کہ اقبال کے سوانحاتِ زندگی مرتب کئے جائیں۔ اور وفات سے معاً بعد فرمائشی خطوط اس کثرت سے آنا شروع ہوئے۔

کہ آخر مہتمم اشاعت ادب لاہور کو مجبور ہونا پڑا۔ اور یہ خدمت میرے سپرد کی گئی۔ میں اپنے آپ کو خوش قسمت سمجھتا ہوں۔ کہ اتنی عظیم الشان خدمت میرے سپرد ہوئی۔ مگر چونکہ وقت بہت تھوڑا ہے۔ اس لئے اگر یہ تالیف تشنۂ تکمیل رہے۔ تو میں ناقابلِ مواخذہ ہوں۔ البتہ یہ ضرور وعدہ کرتا ہوں۔ کہ دوسرے ایڈیشن میں ان تمام کوتاہیوں کا ازالہ کر دیا جائیگا۔

اس رسالہ کی تدوین میں اس بات کا خاص طور پر لحاظ رکھا گیا ہے۔ کہ اُن تمام واقعات کے لکھنے سے احتراز کیا جائے۔ جن میں شک و شبہ کا ذرا بھی شائبہ پایا جاتا ہو۔ بلکہ تمام کوشش حقائق و معارف کے اقتباس پر صرف کی گئی ہے۔

مہتمم اشاعت ادب لاہور نے کئی آدمی واقعات کی تحقیق پر مامور کئے ہیں۔ بلکہ ایک مکمل ادارہ اس خدمت میں اپنے اوقات صرف کر رہا ہے۔ لہذا امید ہے۔ کہ دوسرے ایڈیشن میں یہ رسالہ بہت زیادہ ضخیم ہوگا۔ اور فدائیانِ اقبال کی تشنگی کے لئے ممد و معاون ثابت ہوگا۔

طالب فارسی لکھنوی

سوانح اقبالؒ

زندگی واقعات کی نیرنگی اور تغیرات کی چلتی پھرتی تصویر کا نام ہے۔ یہ تصویر مصور قدرت کی رنگ آمیزیوں سے مزین ہوکر ارض ہستی پر طلوع کرتی ہے۔ اور اپنے معینہ اوقات کے دوران میں غروب ہو جاتی ہے۔ اس کے طلوع کا وقت نہایت شاندار اور غروب کا وقت نہایت دلخراش ہوتا ہے۔ اس میں شک نہیں۔ کہ قدرت کی تمام رنگینیاں اور تمام دلفریبیاں اِس تصویر میں موجود ہوتی ہیں۔ لیکن ایسی ہستی کوئی بھی نظر نہیں آتی۔ جس میں آخر وقت تک وہ رنگینیاں اور دلفریبیاں موجود رہتی ہوں۔ اِسلئے کہ انسان دنیا میں آتے ہی اس میں دوسرے رنگ بھرنا شروع کرتا ہے۔ جو تقاضائے فطرت ہے۔ یہ رنگ اکثر ناپائیدار ہوتے ہیں۔ مگر مقدس ہیں وہ لوگ جن کی رنگ آمیزی کو ثبات اور پائیداری حاصل ہوتی ہے۔ ایسی ہی معدودے چند ہستیوں میں سے ایک ہستی علامہ اقبال مرحوم کی تھی۔ جن کا وجود آج سے چندروز پہلے دنیا کے لئے باعثِ رحمت تھا۔ اور اب ہماری آنکھوں سے روپوش ہے۔

غالب کے بعد اہل ہندوستان مایوس ہو چکے تھے۔ کہ اب کوئی ایسا شخص پیدا نہ ہوگا۔ جو اُردو شاعری کے جسم میں ایک نئی رُوح پھونک دے۔ مگر اقبال کی ہستی نے عملی طور پر اس خیال کی تردید کی۔ اور بتا دیا کہ غالب کا بے نظیر تخیل اور نرالا اندازِ بیان اس طرح زندہ کیا جا سکتا ہے۔ یہ اُردو زبان کی خوش اقبالی تھی۔ کہ اس پر آشوب زمانے میں اقبال جیسا شاعر اس کو نصیب ہوا۔ جس کے کلام کا سکہ تمام ہندوستان کی اُردو شناس دُنیا کے دِلوں پر بیٹھا ہوا ہے۔ اور جس کی شہرت دُنیا کے گوشہ گوشہ تک پہنچ چکی ہے۔

غالب اور اقبال میں بہت زیادہ مشابہت تھی۔ بلکہ یُوں کہنا چاہیئے کہ اکثر باتوں میں یہ دونوں مشترک تھے۔ میں تناسخ کا قائل نہیں۔ ورنہ یہ ضرور کہتا۔ کہ غالب کے دِل میں جو اُردو اور فارسی شاعری کے جذبات مشتعل تھے۔ ان کی بدولت اس کو عدم میں بھی آرام نصیب نہ ہوا۔ اور پھر مجبوراً ایک جسد خاکی میں جلوہ افروز ہوا۔ تاکہ چمن اُردو کی آبیاری کرے۔ علامہ مرحوم ۱۸۷۶ء میں پیدا ہوئے۔ آپکی گوت سپرو اور برہمن نژاد تھے۔ چنانچہ اِس کے متعلق مرحوم نے ایک شعر بھی فرمایا تھا

میرو مرزا بہ سیاست دِل و دیں باختہ اند
جُز برہمن پسرے محرمِ اسرار کجاست

ابتدائی تعلیم

یہ یگانۂ روزگار شاعر سیالکوٹ کے مردم خیز خطہ میں پیدا ہُوا۔ یقیناً وہ وقت قبول دُعا کا ہوگا۔ جبکہ اِس بے نظیر دماغ والے شاعر کے والد اور والدہ نے اِس کا نام تجویز کیا تھا۔ جو ہر حیثیت سے صحیح ثابت ہُوا۔ ابتدائی تعلیم سیالکوٹ میں حاصل کی۔ اور حسنِ اتفاق سے شمس العلما مولوی سید میر حسن جیسے جید عالم کے فیض تربیت سے مستفید ہونے کا موقعہ مل گیا۔ مولوی صاحب موصوف کی تعلیم کا خاصہ تھا۔ کہ جو کوئی اُن سے اُردو فارسی یا عربی پڑھے۔ اس کی طبیعت میں اس زبان کا صحیح مذاق پیدا ہو جاتا تھا۔ اقبال کی طبیعت میں علم ادب سے مناسبت قدرتی طور پر تھی۔ اور پھر مولوی صاحب موصوف جیسا جید اُستاد ملا۔ جس نے سونے پر سہاگہ کا کام کیا۔ ابھی اقبال سکول ہی میں پڑھتے تھے۔ کہ کلام موزون زبان سے نکلنے لگا۔ اس وقت پنجاب میں اُردو کا رواج عام تھا۔ ہر شہر میں زبان دانی اور شعر و شاعری کا چرچا کم و بیش موجود تھا۔

شاعری کا آغاز

اقبال کی طالب علمی کے زمانے میں سیالکوٹ میں ایک مختصر سا مشاعرہ ہوا کرتا تھا۔ جب طلباء اور دوسرے لوگوں کو علم ہُوا۔ کہ شیخ محمد اقبال کو شاعری سے لگاؤ ہے۔ تو مجبور کیا گیا۔ چنانچہ وقتاً فوقتاً غزل لکھنے

کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ یہ وہ زمانہ تھا۔ کہ ہندوستان میں نواب مرزا داغ دہلوی کا طوطی بول رہا تھا۔ اور چونکہ وہ نظام دکن کے اُستاد تھے۔ اِس بنا پر اور بھی ان کی شہرت کو چار چاند لگ چکے تھے۔ شہرت کی بنا پر ہر نوجوان شاعر کی خواہش ہوتی تھی۔ کہ وہ داغ سے رشتۂ تلمذ پیدا کرے۔ جو لوگ داغ کے پاس پہنچ نہ سکتے تھے۔ وہ خط وکتابت کے ذریعہ ان سے شاگردی کی نسبت پیدا کر لیا کرتے۔ غزلیں ڈاک کے ذریعہ اُن کے پاس جاتیں۔ اور وہ اصلاح کر کے واپس کر دیا کرتے۔ سینکڑوں آدمی اُن سے غائبانہ تلمذ رکھتے تھے۔ اور انہیں اس کام کے لئے ایک معقول عملہ اور محکمہ رکھنا پڑتا تھا۔

اقبال نے بھی داغ کو خط لکھا۔ اور چند غزلیں اصلاح کیلئے بھیجیں۔ اِس صورت سے اقبال کو اُردو زبان دانی کے لئے بھی ایسے یکتائے عصر اُستاد سے نسبت پیدا ہوئی۔ جو اپنے وقت میں زبان کی خوبی کے لحاظ سے غزل گوئی کے فن میں یکتا سمجھا جاتا تھا۔ یہ درست ہے۔ کہ اقبال کے ابتدائی کلام میں وہ باتیں موجود نہ تھیں۔ جن کی بدولت کلام اقبال کو شہرت نصیب ہوئی۔ مگر داغ اپنے وقت کا اُستاد اور تجربہ کار تھا۔ فوراً پہچان گیا۔ کہ پنجاب کے ایک دُور اُفتادہ ضلع کا یہ طالب علم کوئی معمولی غزل گو نہیں۔ اِسی لئے بہت جلد لکھ دیا۔ کہ کلام میں اصلاح کی گنجائش نہیں۔ لہذا یہ سلسلۂ تلمذ دیر تک قائم نہ رہا۔ البتہ اس کی یاد دونوں طرف باقی رہ گئی۔

داغ کا نام اُردو شاعری میں نہایت شاندار درجہ رکھتا ہے۔ اقبال کے دل میں اس مختصر اور غائبانہ تعلق کی قدر مرتے دم تک باقی رہی۔ داغ کی زندگی ہی میں اقبال نے قبول عام کا وہ درجہ حاصل کر لیا تھا۔ کہ داغ مرحوم فخر کیا کرتے تھے۔ کہ اقبال بھی اُن لوگوں میں شامل ہے۔ جن کے کلام کی انہوں نے اصلاح کی ہے۔

سر عبدالقادر بالقابہ کا بیان ہے۔ کہ مجھے خود دکن میں داغ سے ملنے کا کئی مرتبہ اتفاق ہُوا۔ اور میں نے خود ایسے فخریہ کلمات ان کی زبان سے سُنے۔

سیالکوٹ میں ان دنوں صرف انٹرمیڈیٹ کالج تھا۔ اس بنا پر بی۔ اے کی تعلیم کے لئے اقبال کو لاہور آنا پڑا۔ انہیں فلسفہ کی تحصیل کا بڑا شوق تھا۔ اور اس شوق کی تکمیل کے لئے پروفیسر آرنلڈ جیسا شفیق اُستاد ان کو ملا۔ جو بعد میں سر ٹامس آرنلڈ ہو گئے۔ اور جس نے فلسفے کے ساتھ ان کی مناسبت دیکھ کر خاص توجہ سے پڑھانا شروع کیا۔ سر ٹامس آرنلڈ کی غیر معمولی قابلیت۔ قوتِ تحریر بہت اچھی۔ علمی جستجو اور تلاش کے طریق جدید سے خوب واقف تھے۔ ان کا ارادہ ہوا۔ کہ اپنے شاگرد کو اپنے مذاق اور اپنے طرزِ عمل سے حصہ دیں۔ اور وہ اِس ارادے میں کامیاب ہوئے۔ پروفیسر موصوف فیاض طبیعت کے انسان ہونے کی وجہ سے ہمیشہ جوہر قابل کے متلاشی رہا کرتے تھے۔ جب وہ علی گڑھ کالج میں پروفیسر تھے۔ تو اپنے دوست مولانا شبلی کے مذاق علمی

کو پختہ کرنے میں کامیاب ہوئے۔ اور جب لاہور آئے۔ تو یہاں ایک جوہر قابل نظر آیا۔ جس کو تابندہ کرنے کی آرزو ان کے دل میں پیدا ہوئی۔ اسی دوستی اور محبت کا نتیجہ تھا۔ کہ جب پروفیسر صوف انگلستان گئے۔ تو اُن کے پیچھے پیچھے اقبال کو بھی جانا پڑا۔ یہ رشتہ وہاں جا کر اور بھی زیادہ مضبوط ہو گیا۔ اور مرتے دم تک قائم رہا۔ آرنلڈ کو خوشی تھی۔ کہ میری محنت ٹھکانے لگی۔ کہ میرا شاگرد علمی دنیا میں میرے لئے شہرت افزائی کا باعث ہُوا۔ اور اقبال کو بھی اعتراف تھا۔ کہ جس مذاق کی بنیاد شمس العلماء میر حسن نے ڈالی۔ اور جسے داغ کے غائبانہ تعارف نے بام رفعت کی طرف رجوع کرنے کے قابل بنایا۔ اس کے آخری مرحلے آرنلڈ کی شفیقانہ رہبری سے طے ہوئے۔

اقبال نے ۱۸۹۷ء میں پنجاب یونیورسٹی سے بی۔ اے کا امتحان امتیازی حیثیت سے پاس کیا۔ اور ۱۸۹۹ء میں ایم۔ اے پاس کیا۔ انہی ایام میں پروفیسر آرنلڈ سے استفادے کا موقعہ ملا۔ اقبال کی زندگی پر پروفیسر آرنلڈ کی تعلیم کا اثر بہت گہرا تھا۔ چنانچہ جب پروفیسر صوف کا انتقال ہُوا۔ تو اقبال نے اس پر مرثیہ لکھا۔ اور پھر گورنمنٹ کالج میں پروفیسر کی حیثیت سے کام کرتے رہے۔ اسی زمانے میں اکنامکس (معاشیات) پر اُردو میں پہلی کتاب لکھی۔

اقبال کو علم کی تحصیل کے لئے نہایت اچھے اچھے رہبر ملے۔ اور بڑے بڑے زبردست علماء سے سابقہ پڑا۔ ان میں سے مفصلۂ ذیل خاص طور

پر قابلِ ذکر ہیں۔

کیمبرج یونیورسٹی کے ڈاکٹر میک ٹیگرٹ۔ براؤن۔ نکلسن اور سائی پروفیسر نکلسن نے تو یہاں تک کیا۔ کہ اقبال کی مشہور فارسی مثنوی۔ "اسرار خودی" کا انگریزی ترجمہ کر کے اس پر دیباچہ لکھا۔ اور حواشی لکھ کر یورپ و امریکہ وغیرہ سے اقبال کو روشناس کرایا۔ یہ تو اہل یورپ کا ذکر تھا۔ ہندوستان کی علمی دنیا میں جتنے نامور اس زمانے میں موجود تھے۔ اور جو ان کے بعد پیدا ہوئے سب کے سب اقبال کی قابلیت کا اعتراف کرتے رہے۔ مولانا شبلی مرحوم۔ مولانا حالی مرحوم اور اکبر مرحوم خاص طور پر اقبال کے مداح تھے۔ ان سب سے اقبال کی خط و کتابت رہی۔ ان کے اثرات اقبال کے کلام پر اور اقبال کا اثر ان کے طبائع پر پڑتا رہا۔ مولانا شبلی نے بہت سے خطوط میں اقبال کی تعریف کی ہے۔ اور اکبر نے نہ صرف خطوط میں بلکہ بہت سے اشعار میں اقبال کے کمال کا اعتراف کیا ہے۔ اسی طرح اقبال نے بھی اپنی نظموں میں ان باکمالوں کی جا بجا تعریف کی ہے۔

لاہور کے مشاعروں میں شرکت

نوشتی کے زمانے کو چھوڑ کر اقبال کی شاعری کا آغاز ۱۸۹۶ء سے شروع ہوتا ہے۔ ۱۸۹۶ء میں پہلی مرتبہ لاہور کے ایک مشاعرہ میں اپنے ہم جماعتوں کے مجبور کرنے پر اقبال نے ایک غزل پڑھی۔

اِس وقت لاہور کے لوگ اقبال سے واقف نہ تھے۔ مختصر سی غزل تھی۔ سادہ سادہ الفاظ۔ اور زمین بھی مشکل نہ تھی۔ مگر کلام میں شوخی اور بے ساختہ پن موجود تھا۔ اس کے بعد دو تین مرتبہ پھر اسی مشاعرہ میں شریک ہوئے۔ اور غزل پڑھی۔ اب لوگوں کو علم ہوگیا۔ کہ ایک ہونہار شاعر میدان میں آیا ہے۔ لیکن ابتدا میں یہ شہرت کالج کے طلباء اور بعض ایسے لوگوں تک محدود رہی جو تعلیمی مشاغل سے تعلق رکھتے ہیں۔ اِسی اثنا میں ایک ادبی مجلس قائم ہوئی۔ جس میں مشاہیر شریک ہونے لگے۔ اور نظم و نثر کے مضامین کی مانگ ہوئی۔ اقبال نے اس کے ایک جلسے میں ذیل کی نظم پڑھ کر سنائی ؎

ہمالہ

اے ہمالہ اے فصیلِ کشورِ ہندوستاں — چومتا ہے تیری پیشانی کو جھک کر آسماں
تجھ میں کچھ پیدا نہیں دیرینہ روزی کے نشاں — تو جواں ہے گردشِ شام و سحر کے درمیاں

ایک جلوہ تھا کلیمِ طورِ سینا کے لیے
تو تجلی ہے سراپا چشمِ بینا کے لیے

امتحانِ دیدۂ ظاہر میں کوہستاں ہے تو — پاسباں اپنا ہے تو دیوارِ ہندوستاں ہے تو
مطلعِ اول فلک جس کا ہو وہ دیواں ہے تو — سوئے خلوت گاہِ دل دامن کشِ انساں ہے تو

برف نے باندھی ہے دستارِ فضیلت تیرے سر
خندہ زن ہے جو کلاہِ مہرِ عالمتاب پر

تیری عمرِ رفتہ کی اک آن ہے عہدِ کہن   وادیوں میں ہیں تری کالی گھٹائیں خیمہ زن
چوٹیاں تیری ثریا سے ہیں سرگرمِ سخن   تو زمیں پر اور پہنائے فلک تیرا وطن

چشمۂ دامن ترا آئینۂ سیال ہے
دامنِ موجِ ہوا جس کے لئے رومال ہے

ابر کے ہاتھوں میں رہوارِ ہوا کے واسطے   تازیانہ دے دیا برقِ سرِ کہسار نے
اے ہمالہ کوئی بازی گاہ ہے تو بھی جسے   دستِ قدرت نے بنایا ہے عناصر کیلئے

ہائے کیا فرطِ طرب میں جھومتا جاتا ہے ابر
فیلِ بے زنجیر کی صورت اڑا جاتا ہے ابر

جنبشِ موجِ نسیمِ صبح گہوارہ بنی   جھومتی ہے نشۂ ہستی میں ہر گل کی کلی
یوں زبانِ برگ سے گویا ہے اسکی خامشی   دستِ گلچیں کی جھٹک میں نے نہیں دیکھی کبھی

کہہ رہی ہے میری خاموشی ہے افسانہ مرا
کنجِ خلوت خانۂ قدرت ہے کاشانہ مرا

آتی ہے ندی فرازِ کوہ سے گاتی ہوئی   کوثر و تسنیم کی موجوں کو شرماتی ہوئی
آئینہ سا شاہدِ قدرت کو دکھلاتی ہوئی   سنگِ رہ سے گاہ بچتی گاہ ٹکراتی ہوئی

چھیڑتی جا اس عراقِ دل نشیں کے ساز کو
اے مسافر دل سمجھتا ہے تری آواز کو

لیلیٔ شب کھولتی ہے آکے جب زلفِ رسا   دامنِ دل کھینچتی ہے آبشاروں کی صدا
وہ خموشی شام کی جس پر تکلم ہو فدا   وہ درختوں پر تفکر کا سماں چھایا ہوا

کانپتا پھرتا ہے کیا رنگِ شفق کہسار پر
خوشنما لگتا ہے یہ غازہ ترے رخسار پر

اے ہمالہ داستاں اُس وقت کی کوئی سنا مسکنِ آبائے انساں جب بنا دامن ترا
کچھ بتا اُس سیدھی سادی زندگی کا ماجرا داغ جس پر غازۂ رنگِ تکلف کا نہ تھا
ہاں دکھا دے اے تصور پھر وہ صبح و شام تو
دوڑ پیچھے کی طرف اے گردشِ ایام تو

اِس نظم میں انگریزی خیالات اور فارسی بندشیں۔ اس پر خوبی یہ۔ کہ وطن پرستی کی چاشنی موجود تھی۔ مذاقِ زمانہ اور ضروریاتِ وقت کے موافق ہونے کے سبب بہت زیادہ مقبول ہوئی۔ اور ہر طرف سے فرمائشیں ہونے لگیں۔ کہ اسے شائع کیا جائے۔ مگر اقبال نے یہ عذر کرکے ٹال دیا۔ کہ ابھی نظرِ ثانی کی ضرورت ہے۔ اور نظم نہ دی۔

سر عبدالقادر بالقابہ نے بانگِ درا کے دیباچے میں لکھا ہے۔ کہ اقبال کو یہ خیال تھا۔ کہ اس نظم میں ابھی خامیاں باقی ہیں۔ اس لئے شائع ہونا مناسب نہیں۔ شیخ صاحب موصوف اقبال کے بچپن کے دوست ہیں۔ ممکن ہے۔ ان کا یہ بیان درست ہو۔ لیکن میں اس سے متفق نہیں۔ اقبال کی زندگی کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ وہ شہرت سے ہمیشہ بے نیاز اور متنفر رہا۔ لیکن شہرت اس سے کبھی بے نیاز نہ ہوئی۔ وہ جاہ و منزلت سے صرف بے پرواہ نہیں۔ بلکہ کوسوں دُور بھاگتا تھا۔ اس کی فطرت درویشانہ اور طبیعت فقیرانہ تھی۔ اس کی کلام میں بار بار نظر آتا ہے۔ کہ اس نے اپنے آپ کو "فقیر" اور "درویش" اور "قلندر" سے مخاطب کیا ہے۔ یہ کوئی شاعرانہ تخیل آرائی نہ تھی۔ بلکہ اس کی فطرت

کے صحیح احساس کا اظہار تھا۔ جن لوگوں کو دو ایک مرتبہ بھی اس کی مجلس میں باریابی کا موقع ملا۔ وہ معترف ہیں۔ کہ واقعی درویش منش انسان تھا۔ حقیقت یہ ہے۔ کہ اہل ہندوستان نے اس جلیل القدر انسان کی قدر نہ کی ——— غازی مصطفےٰ کمال کو تعجب ہے۔ کہ اہل ہندوستان کیوں غلامی کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔ جبکہ ان میں اقبال جیسا فقید المثال شاعر حیات آفرین فلسفی۔ انقلاب افروز صاحب دل۔ اور صاحب نظر موجود ہے۔

جرمنی۔ فرانس۔ انگلستان اور دیگر آزاد اقوام کے صاحب نظر لوگ حیران ہیں۔ کہ غلام نواز ہند کی کرخت مٹی سے اس قدر عالی دماغ ہستی کس طرح پیدا ہوگئی۔ جس نے مشرق و مغرب کی تجربہ گاہ عصری کا پورا پورا جائزہ لیکر زندگی کے رازہائے سربستہ کو بے نقاب کے رکھ دیا۔

اقبال کو سمجھنے کے لئے۔ اس کی زندگی کو جاننے کے لئے اور اس کے فیضان صحبت و ارشادات کے اثرات کا جائزہ لینے کے لئے ملت اسلامیہ کے سینکڑوں قابل افراد کی عمریں صرف ہو جائینگی۔ ایسی فقید المثال ہستیاں نوادر روزگار میں سے ہوتی ہیں۔ اور روز روز نہیں آیا کرتیں۔

میں حیران ہوں۔ کہ اقبال کی طبیعت میں کس غضب کی روانی تھی۔ اور قدرت کی طرف سے کیسی فکر رسا عطا ہوئی تھی۔ جس کی نظیر ہندوستان میں تو کیا۔ بیرون ہندوستان میں بھی نہیں ملتی۔

مجھے بہت سے شاعروں کی ہمنشینی کا موقع ملا ہے۔ مبتدی بھی دیکھے۔ اور منتہی بھی۔ لیکن یہ بات کسی میں نہ پائی۔ اقبال کی ابتدا اور دوسروں کی انتہا یکساں نظر آتی ہے۔ ۱۸۹۹ء میں انجمن حمایت اسلام لاہور کا سالانہ جلسہ ہُوا۔ اب اقبال کو لاہور میں ہر شخص جانتا تھا۔ اس وقت اقبال کی شاعری کا آغاز تھا۔ انجمن کی طرف سے نظم پڑھنے کی دعوت دی گئی۔ اور مجبور کیا گیا۔ کہ اس جلسہ میں ضرور شریک ہوں۔ چنانچہ اقبال نے اپنی مشہور نظم نالۂ یتیم پڑھ کر سنائی۔ یہ نظم بہت زیادہ مقبول ہوئی۔ اور اسی نظم کی بدولت اقبال کی شہرت کا آغاز ہُوا۔

پبلک طور پر شاعری کا آغاز

اپریل ۱۹۰۱ء میں رسالہ مخزن سر عبدالقادر کی ادارت میں لاہور سے شایع ہونا شروع ہُوا۔ اسی پرچہ میں اقبال کی نظم "ہمالہ" نکلی۔ گویا اقبال کی شاعری کا پبلک طور پر آغاز ۱۹۰۱ء سے ہوتا ہے۔ اور یہ سلسلہ بدستور جاری رہا۔ مخزن کے ہر نمبر میں اقبال کی کوئی نہ کوئی نظم ضرور ہوتی تھی۔ جس قدر لوگوں کو اقبال کی شاعری کا علم ہوتا گیا۔ اتنی ہی زیادہ رسالہ جات اور اخبارات کی فرمائشیں آنے لگیں۔ اقبال کو اس وقت گورنمنٹ کالج میں پروفیسر کی جگہ مل چکی تھی۔ اور دن رات علمی صحبتوں اور مشاغل میں بسر ہوتے تھے۔ طبیعت دردوں پر تھی۔ شعر کہنے پر جس وقت مائل ہوتے۔ تو غضب کی آمد ہوتی۔ ایک

ایک نشست میں ہزار ڈیڑھ ہزار شعر کہہ لینا معمولی بات تھی۔ اقبال کے دوست اور بعض طالب علم جو پاس ہوتے پنسل کاغذ لیکر بیٹھ جاتے۔ اور لکھتے جاتے۔ وہ اپنی دُھن میں کہتے جاتے۔ مَیں نے خود مرحوم کی زبانی سُنا ہے۔ کہ اس زمانے میں انہیں کبھی فکرِ سخن کے اوقات میں کاغذ قلم کی ضرورت پیش نہ آتی تھی۔ موزوں الفاظ کا ایک چشمہ اُبلتا ہوا معلوم ہوتا۔ اور ایک خاص کیفیت رقّت کی ان پر طاری ہوتی۔ اپنے اشعار سریلی آواز میں ترنم سے پڑھتے تھے۔ خود وجد کرتے۔ اور دوسروں کو وجد میں لاتے تھے۔ اقبال کے حافظہ کی یہ عجیب خصوصیت تھی۔ کہ جتنے شعر ایک نشست میں زبان سے نکلتے تھے۔ وہ چاہے مسلسل نظم کی صورت میں ہوں۔ یا غزل سب کے سب دوسرے وقت یا دوسرے دن اسی ترتیب سے حافظہ میں محفوظ ہوتے۔ اور درمیان میں خود ان کو قلمبند کرنے کی عادت نہ تھی۔

ابتدا میں شعرا جلسہ عام میں تحت اللفظ نظمیں پڑھا کرتے تھے۔ اور اس طرز میں ایک خاص لطف تھا۔ مگر بعض دوستوں نے ایک مرتبہ جلسہ عام میں اقبال کو مجبور کیا۔ کہ وہ نظم ترنم سے پڑھیں۔ ان کی آواز قدرتاً بلند اور خوش آئند تھی۔ طرز ترنم سے بھی اچھی خاصی واقفیت تھی۔ لہذا اقبال کو مجبور ہو کر پڑھنا پڑا۔ اور ایسا سماں بندھا کہ سکوت کا عالم طاری ہوگیا۔ اور لوگ جھومنے لگے۔ اس کے دو نتیجے ہوئے۔ ایک تو یہ کہ آئندہ ان کے لئے تحت اللفظ پڑھنا مشکل ہوگیا۔

دوسرے یہ کہ پہلے تو خواص ہی اُن کے کلام کے قدردان تھے۔ اور اس کو سمجھ سکتے تھے۔ لیکن اِس کشش کے سبب عوام بھی کھنچ آئے۔ حمایت اسلام کے جلسہ میں جب اقبال کی نظم پڑھی جاتی۔ تو دس دس ہزار آدمی ایک وقت میں جمع ہو جاتے۔ اور جب تک نظم ختم نہ ہوتی۔ ہر شخص دم بخود بیٹھا رہتا۔

۱۹۰۵ء سے اقبال کی شاعری کا دوسرا دور شروع ہوتا ہے۔ یہ وہ زمانہ ہے۔ جو یورپ میں بسر ہوا۔ اس میں شک نہیں۔ کہ قیام یورپ کے زمانے میں اقبال کو شاعری کے لئے نسبتاً کم وقت ملا۔ اور ان نظموں کی تعداد بہت کم ہے۔ جو اس زمانے میں لکھی گئیں۔ مگر پھر بھی ان کا ایک خاص رنگ ہے۔

اقبال کے قیام یورپ کا زمانہ وہ پُر آشوب زمانہ تھا۔ جبکہ دول یورپ دنیائے اسلام کو تباہ کرنے پر تُلے ہوئے تھے۔ اس لئے اس نے اسلامی رنگ میں نظمیں کہنا شروع کر دیں۔ اور مسلمانوں کو تیرہ سو برس کا بھولا ہوا سبق یاد دلایا۔ چنانچہ اس سلسلہ کی پہلی کڑی وہ مشہور نظم جو اقبال نے سسلی کے کھنڈرات دیکھنے کے بعد لکھی۔ یہ نظم حقیقتاً شوکت اسلامیہ کا مرثیہ ہے۔ جس کو پڑھ کر دل پاش پاش ہو جاتا ہے۔

فارسی گوئی کی ابتداء

قیام یورپ کے زمانے میں اقبال کے ایک دوست نے ایک دن ان کو مدعو کیا۔ جہاں اُن سے فارسی اشعار سنانے کی فرمائش

کی گئی۔ مگر چونکہ اقبال نے اس وقت تک فارسی شاعری کی طرف توجہ نہ کی تھی۔ اس لئے اعتراف کرنا پڑا۔ کہ اب تک ایک آدھ شعر کے علاوہ فارسی میں زیادہ لکھنے کا موقع نہیں ملا۔ اور نہ کوشش کی گئی۔ مگر وہ کچھ ایسا وقت تھا۔ اور اس فرمایش نے ایسی تحریک اقبال کے دل و دماغ میں پیدا کی۔ کہ دعوت سے واپس آکر وہ تمام رات فارسی میں اشعار لکھتے رہے۔ اور صبح ہوتے ہوتے دو غزلیں تیار تھیں۔ ان غزلوں سے اقبال کو اپنی فارسی گوئی کی قوت کا حال معلوم ہوا۔ اور پھر فارسی میں لکھنا شروع کر دیا۔

قیام انگلستان کا زمانہ کامیابی سے ختم ہوا۔ کیمبرج یونیورسٹی سے ڈگری حاصل کرکے اقبال نے جرمنی کا رُخ کیا۔ اور علمی دُنیا کے اعلےٰ مدارج طے کرکے پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ اس سفر کے دوران میں اقبال نے بہت سی فارسی کی کتابوں کا مطالعہ کیا۔ اور اس مطالعہ کا خلاصہ ایک محققانہ کتاب کی صورت میں شائع ہوا۔ جسے فلسفۂ ایران کی مختصر تاریخ کہنا چاہیئے۔ اسی کتاب کو دیکھ کر جرمنی والوں نے اقبال کو ڈاکٹر کا علمی درجہ دیا۔

۱۹۰۸ء میں اقبال نے ہندوستان واپس آکر فارسی زبان کو اپنے لئے اظہار کا ذریعہ قرار دیا۔ اس کا یہ مطلب نہیں۔ کہ اُردو میں نظمیں لکھنا بالکل ترک کر دیں۔ مگر زیادہ طبیعت کا رجحان فارسی کی طرف ہوگیا۔ یہ اقبال کی شاعری کا تیسرا دور ہے۔ اس دوران میں

اُردو نظمیں بھی بہت سی لکھیں۔ جن کی دھوم مچ گئی۔ لیکن اصل کام جس کی طرف وہ متوجہ ہو گئے۔ وہ فارسی کی مثنوی "اسرار خودی" تھی۔ اس کا خیال دیر تک اقبال کے دماغ میں رہا۔ اور رفتہ رفتہ دماغ سے صفحۂ قرطاس پر اُترنے لگا۔ آخر ایک مستقل کتاب کی صورت میں ظہور پذیر ہوا۔ جس کی بدولت اقبال کا نام ہندوستان سے باہر بھی مشہور ہو گیا۔

فارسی میں اقبال کے قلم سے پانچ کتابیں نکلی ہیں۔ "اسرار خودی" "رموز بیخودی"۔ "پیام مشرق"۔ "جاوید نامہ" اور "مسافر" ایک سے بہتر ایک۔ پہلی کتاب کی نسبت دوسری کتاب کی زبان زیادہ سادہ اور عام فہم ہو گئی۔ اور تیسری دوسری سے زیادہ سلیس ہے۔

جو لوگ اقبال کے اُردو کلام کے دلدادہ تھے۔ وہ فارسی نظموں کو دیکھ کر مایوس ہو چکے تھے۔ مگر جب اُن کو معلوم ہوا۔ کہ فارسی نے وہ کام کیا۔ جو اُردو سے نہ ہو سکتا تھا۔ تو خوش ہوئے۔ تمام اسلامی دنیا میں جہاں فارسی کم و بیش متداول ہے۔ اقبال کا کلام اس صورت سے پہنچ گیا۔ اور ان میں بھی ایسے خیالات تھے۔ جن کی اسی پیمانہ پر اشاعت ہونا چاہیئے تھی۔ اور اسی وسیلہ سے یورپ و امریکہ والوں کو اقبال جیسے قابل قدر مصنف کا حال معلوم ہوا۔ پیام مشرق میں اقبال نے یورپ کے ایک بلند پایہ شاعر گوئٹے کے "سلام مغرب" کا جواب لکھا ہے۔ اور اس میں نہایت

حکیمانہ خیالات کا اظہار کیا ہے۔ اُن اشعار میں بعض بڑے بڑے عقدے حل ہوئے ہیں۔ جو پہلے ایسے آسان طریقے سے بیان نہ ہوئے تھے۔

سَر کا خطاب

جنگِ عظیم کے موقعہ پر اقبال نے ایک نظم لکھی۔ جو سرکاری اخبار "حق" میں شائع ہوئی۔ یہ نظم اپنی نوعیت کے لحاظ سے ایک خاص انداز کی حامل تھی۔ اور سرکاری و غیر سرکاری حلقوں میں بیحد مقبول ہوئی۔ لیکن گورنمنٹ زیادہ تر اقبال کے علم و فضل اور اس کی قدر و قیمت سے اس وقت واقف ہوئی جبکہ "اسرارِ خودی" اور "رموزِ بیخودی" نے یورپ کے اخبارات اور اہلِ علم طبقہ میں اچھی خاصی جگہ پیدا کر لی۔ اور جب اہلِ مغرب نے مشرق کے ایک شاعر کا فلسفۂ حیات نئی زبان اور نئے انداز میں دیکھا۔ تو بے ساختہ ان کی زبان سے نکل گیا ؎

آتشے از سینۂ اہلِ عجم افروختی
در فضائے غرب سیلِ اضطراب آوردۂ

چنانچہ ۱۹۲۳ء میں اقبال کی شاندار علمی خدمات کے صلہ میں حکومت کی طرف سے نائٹ (سَر) کا عظیم القدر خطاب ملا۔ یہ خطاب ایک ایسے شاعر کو ملا تھا۔ جس نے ابھی خطابات

اور جاہ و منصب کی خواہش نہ کی تھی۔ بلکہ وہ ہمیشہ آزادی و حریت کی تعلیم دیا کرتا تھا۔ بعض حاسدین کا خیال تھا۔ کہ اقبال گورنمنٹ کا آدمی ہے۔ چنانچہ اس موقعہ پر چہ میگوئیاں ہوتی رہیں۔ ایک نظم کے تین چار شعر درج کئے جاتے ہیں۔ جو ایک مقامی اخبار میں شائع ہوئی تھی ؎

لو مدرسۂ علم ہوا قصر حکومت
افسوس کہ علامہ سے سر ہو گئے اقبال
پہلے تو سر ملت بیضا کے تھے وہ تاج
اب اور سنو "تاج" کے سر ہو گئے اقبال
کہتا تھا یہ کل ٹھنڈی سڑک پر کوئی گستاخ
سرکار کی دہلیز پہ سر ہو گئے اقبال

لیکن اقبال کی اس عزت افزائی پر جو عظیم الشان پارٹی جہانگیر کے مقبرہ میں لاہور کے سکھوں۔ مسلمانوں اور ہندوؤں کی طرف سے دی گئی۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے۔ کہ ملک نے اس فلسفی شاعر کی عزت کو کس وقعت اور فخر کی نظر سے دیکھا۔ اس پارٹی میں لاہور کے معززین۔ پنجاب کے مختلف شہروں کے اکابر اور اہل علم کے علاوہ اکثر انگریز حکام اور خود گورنر پنجاب بھی شریک تھے۔ اقبال نے اس موقعہ پر انگریزی زبان میں ایک دلچسپ تقریر کی۔ اور اسی تقریر کے ذریعہ لوگوں کے کان پہلی مرتبہ

اقبال کی مشہور تصنیف "پیام مشرق" سے آشنا ہوئے۔ جو جرمنی شاعر گوئٹے کے جواب میں تصنیف ہو رہی تھی۔

میسور۔ مدراس اور حیدرآباد دکن کا سفر

دسمبر ۱۹۲۸ء کے آخری ایام میں اقبال کو چند لکچر دینے کے لئے مدراس میں دعوت دی گئی۔ اور وہاں تین دن قیام رہا۔ مختلف افراد اور انجمنوں نے ایڈریس پیش کئے۔ اور دعوتیں دیں۔ مدراس۔ بنگلور اور میسور کے قریباً ہر انگریزی اور اردو اخبار نے اقبال کے فوٹو شائع کئے۔ اخبارات کے نمائندوں نے اور مذہب و فلسفہ کے بڑے بڑے عالموں نے مذہب و فلسفہ اور سیاسیات پر گفتگو کی۔ مدراس کی انجمن ترقی اردو۔ ہندی پرچار سبھا اور جنوبی ہند کے برہمن عالموں کی طرف سے سپاسنامے پیش کئے گئے۔

۹ جنوری ۱۹۲۹ء کو جب اقبال بنگلور کے سٹیشن پر پہنچے۔ تو شمالی ہند کے ہزارہا آدمی اس یگانۂ روزگار ہستی کو دیکھنے کے لئے سٹیشن پر موجود تھے۔ یہاں اقبال کو مسلم لائبریری کی طرف سے ایک جلسہ میں ایڈریس دیا گیا۔ اور اس جلسہ کے صدر امین الملک دیوان مرزا اسمٰعیل چیف منسٹر میسور تھے۔ طلبا اور تعلیم یافتہ لوگوں نے اقبال کے خیالات سے مستفیض ہونے کے لئے

ایک جلسہ کا اہتمام کیا۔ اور جلسہ کے صدر ڈاکٹر سبرائن ڈائرکٹر محکمۂ تعلیمات میسور تھے۔ مہاراجہ میسور کا دعوت نامہ اقبال کو بنگلور ہی میں مل چکا تھا۔ اس لئے ۱۷ جنوری کو گورنمنٹ میسور کے مہمانخانے میں فروکش ہونے کے لئے اقبال میسور روانہ ہو گئے۔ خاص شہر میسور میں میسور یونیورسٹی کی طرف سے اقبال کے لیکچر کا انتظام کیا گیا۔ دوسرے دن ٹاؤن ہال میں مسلمانان میسور نے ایڈریس پیش کیا۔ جہاں ہندو بھی مدعو تھے۔

میسور یونیورسٹی کے فلسفہ کے پروفیسر جو غیر مسلم تھے۔ انہوں نے اپنی تقریر کے دوران میں کہا۔ کہ "ڈاکٹر اقبال کو مسلمان لاکھ اپنا کہیں مگر وہ ہم سب کے ہیں۔ کسی ایک مذہب یا جماعت کی ملکیت نہیں۔ اگر مسلمانوں کو اس بات پر ناز ہے۔ کہ اقبال ان کا ہم مذہب ہے۔ تو ہم ہندوستانیوں کو یہ فخر کم نہیں۔ کہ اقبال ہندوستانی ہے"۔

میسور۔ بنگلور اور سری رنگ پٹن اور دوسرے مقامات دیکھنے کے بعد اقبال ۱۹ جنوری کو حیدر آباد پہنچے۔ جہاں سٹیشن پر مسلمان بچے ایک قطار میں کھڑے ہو کر "چین و عرب ہمارا ہندوستاں ہمارا" کی نظم خوش الحانی کے ساتھ پڑھ رہے تھے۔ سٹیشن پر عوام کے علاوہ عثمانیہ یونیورسٹی کے تمام ارکان موجود تھے۔ یہیں اقبال کو اطلاع دی گئی۔ کہ آپ نظام گورنمنٹ کے مہمان ہیں۔ اسلئے سیدھے گورنمنٹ مہمان خانے میں جانا ہوگا۔ ۲۰ جنوری کی صبح کو

۱۱ بجے اعلیٰ حضرت حضور نظام سے ملنے کا موقعہ ملا۔ حیدرآباد دکن میسور اور مدراس کے اخباروں نے اقبال کی علمی فضیلت پر مضامین اور تصویریں شائع کیں۔ اور میسور کے اخبار الکلام نے اقبال نمبر شائع کیا۔

اقبال اور پنجاب کونسل

اقبال کی حریت پسندی مشہور ہے۔ عملی طور پر میدان سیاست میں آنے کے لئے وہ اپنے آپ کو موزوں نہ سمجھتے تھے۔ چنانچہ وہ خود ایک خط کے جواب میں لکھتے ہیں ؎

یہ عقدہ ہائے سیاست تجھے مبارک ہوں
کہ فیض عشق سے ناخن مرا ہے سینہ خراش

پھر ایک اور شعر میں اپنی خاموش زندگی کا اس طرح ثبوت دیتے ہیں ؎

اقبال بڑا اپدیشک ہے من باتوں میں موہ لیتا ہے
گفتار کا غازی بن تو گیا کردار کا غازی بن نہ سکا

لیکن ان سب باتوں کو جاننے کے باوجود ان کے دوستوں اور عقیدت مندوں نے ان کو کونسل کی انتخابی جدوجہد کیلئے تیار کیا۔ کونسلوں کے انتخابات کے موقع پر امیدواروں کی طرف سے ہزارہا روپے خرچ ہو جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ ووٹروں کی

خوشامدیں اور خاطر مدارت پر جو خرچ ہوتا ہے۔ اس کا ذکر نہیں۔ دیکھنے والے جانتے ہیں۔ کہ اقبال ہی پہلا کونسل کا ممبر تھا جس کے لئے دو جلیل القدر امیدواروں نے اپنے نام واپس لے لئے۔ اور شہر کی تمام برادریوں نے اقبال کی حمایت میں علیحدہ علیحدہ اشتہارات شایع کئے۔ اور اقبال کوئی پیسہ خرچ کئے بغیر ۲۳ نومبر ۱۹۲۶ء کے پولنگ میں اپنے مدمقابل پر اتنے کثیر ووٹوں پر کامیاب ہوئے۔ جن کی توقع بھی نہ تھی۔ یہ اس بات کا ثبوت ہے۔ کہ جمہور اسلام۔ طبقۂ اعلےٰ اور تعلیم یافتہ نوجوان اقبال کی قابلیت اور اقبال کی ذات پر پورا پورا اعتماد رکھتے ہیں۔ مختلف اخبارات نے اقبال کی حیرت انگیز کامیابی پر مضامین لکھے۔ چنانچہ زمیندار ۵ دسمبر ۱۹۲۶ء کی اشاعت میں لکھتا ہے۔

"ساری دنیا جانتی ہے۔ کہ علامہ ممدوح ایسی نادرالوجود شخصیتیں صدیوں کے بعد پیدا ہوا کرتی ہیں۔ موجودہ مسلمانان ہند میں شاید علامہ ممدوح ہی وہ ممتاز ترین ہستی ہیں۔ جن کے علم و فضل کے روبرو یورپ و امریکہ کی کلاہ افتخار کو بھی مضطربانہ جھکنا پڑا ہے۔ ایک ایسے وجود کا کونسل کی رکنیت کے لئے امیدوار بننا مسلمانان لاہور کے لئے علی الخصوص اور مسلمانان پنجاب کیلئے علی العموم بڑی خوش قسمتی اور سعد بختی کا موجب ہے"

اقبال کونسل میں مسلمانوں کے نمائندے بن کر گئے۔ اور کونسل کے مختلف اجلاسوں میں کئی سوالات مسلمانوں کی فلاح و ترقی کے لئے کئے۔ لیکن اقبال کا دل ملکی درد سے لبریز تھا خصوصاً غریب طبقہ (مزدور کاشتکار) کے ساتھ ان کو فطری انس اور ہمدردی تھی۔ اس لئے ان کی زیادہ تر کوشش یہی رہی۔ کہ زمینداروں کا مالیہ کم ہو۔ انکم ٹیکس اور آبیانہ میں تخفیف ہو۔ اور تقریباً اسی پر ان کی تمام کوشش صرف ہوتی رہی۔

ملک میں ایک ایسا طبقہ بھی ہے۔ جو حکومت کو مشکلات میں ڈالنے کے لئے قوموں میں تفرقہ اور ملک میں بدامنی پیدا کرنے کے لئے مذہبی پیشواؤں اور بزرگوں پر کمینے حملے کرتا رہتا ہے۔ اقبال نے اس کے متعلق تحریک پیش کی۔ کہ گورنر جنرل باجلاس کونسل سے سفارش کی جائے۔ کہ بانیان مذہب پر توہین آمیز شرانگیز اور کمینہ حملوں کی اشاعت کا سدباب کرنے کے لئے ایک ریگولیشن نافذ کیا جائے۔ چنانچہ ۱۹۲۷ء سے یہ قانون نافذ چلا آتا ہے۔ تلوار کو قانون اسلحۂ ہند سے مستثنٰی کرانے کی بھی تحریک اقبال ہی نے پیش کی۔ شراب کی لعنت کو دور کرنے کے لئے اقبال نے ایک قرارداد پیش کی۔ کہ شراب نوشی کے انسداد کی حکمت عملی کا منتہائے نظر امتناع تسلیم کیا جائے۔ اور اس کی میعاد پندرہ سال سے متجاوز نہ ہو۔

نیلی بار منٹگمری کے ضلع میں سوا تین لاکھ ایکڑ رقبہ سرکار نے فروخت کیا ہے۔ اس کا زیادہ حصہ سرمایہ داروں ہی نے خریدا۔ اس کے متعلق اقبال نے یہ تحریک پیش کی۔ کہ اس کا نصف حصہ مزارعین یعنے کسانوں کے لئے مخصوص کیا جائے۔ جو اپنے ہاتھ سے کھیتی باڑی کرتے ہیں۔

شہروں میں جب وبا پھیلتی ہے۔ تو اس کے انسداد کے لئے سرکاری وغیر سرکاری انتظامات شروع ہو جاتے ہیں۔ اور ہر قسم کی طبی امداد مل سکتی ہے۔ لیکن دیہاتوں میں یہ صورت نہیں۔ اس لئے اقبال نے دیہاتیوں کے مفاد کے لئے یہ تحریک پیش کی۔ کہ سرکاری اور غیر سرکاری ارکان کی ایک مجلس مقرر کی جائے۔ جو دیہات میں حفظانِ صحت کے طریقوں پر ترقی کی رپورٹ کرے۔

۲۸ فروری ۱۹۳۲ء کے اجلاس کونسل میں وزیر مالیات نے جو میزانیہ پیش کیا۔ اس پر اقبال نے ایک زبردست تبصرہ کرتے ہوئے نظام محاصل کی بے ضابطگیوں کو بے نقاب کیا۔ اور تخفیف محاصل پر بحث کرتے ہوتے کہا۔ بے ضابطگی یہ ہے۔ کہ زمین کے معاملہ میں یہ نظریہ قائم کر لیا جاتا ہے۔ کہ ساری زمین حکومت کی ملکیت ہے۔ اس ملکیت عامہ کا دعوے نہ عہد قدیم میں کسی نے کیا۔ اور نہ سلاطین مغلیہ کے زمانے میں ایسا مطالبہ پیش کیا گیا۔ یہ اس

مسئلہ کا تاریخی پہلو ہے۔ جسے مجلس تحقیقات محاصل بھی تسلیم کر چکی ہے۔ امر واقعہ یہ ہے۔ کہ اس ملک میں حکمران طاقت نے کبھی اس قسم کے حقوق کا مطالبہ نہیں کیا۔ ہمیں بتایا جاتا ہے۔ کہ مغلوں نے ایسا دعوے کیا تھا۔ لیکن پنجاب کے باشندے اس ملک کی زمین کے اس وقت سے مالک چلے آتے ہیں۔ جبکہ بابر کی نسل نے تاریخ کے ایوان میں قدم بھی نہ رکھا تھا۔ اس سے صرف ایک نتیجہ نکلتا ہے۔ کہ بادشاہتیں بنتی اور بگڑتی رہتی ہیں۔ اور صرف قوم زندہ و سلامت رہتی ہے۔ اور اگر کسی وقت کسی ملک میں یہ نظریہ رائج بھی تھا۔ تو اس بیسویں صدی میں اُسے جائز نہیں مانا جا سکتا۔ اس وقت زمین کے ہر چھوٹے بڑے قطعہ کے لئے معاملہ لیا جاتا ہے۔ خواہ کسی شخص کے پاس دو کنال زمین ہو۔ خواہ دو سو کنال۔ بہر صورت اسے معاملہ ادا کرنا پڑتا ہے۔ اس کے برعکس انکم ٹیکس کے باب میں صلاحیت و استطاعت کے اصول یا مدارج کے اصول پر عمل کیا جاتا ہے۔ یعنے ایک تدریجی پیمانہ قائم ہے۔ بعض لوگوں سے قطعاً کوئی انکم ٹیکس نہیں لیا جاتا۔ میری گزارش یہ ہے۔ کہ کونسل کو اس اصول کی روشنی میں تخفیف محاصل کے مسئلہ پر نظر ڈالنی چاہیئے۔"

۱۹۲۷ء میں سرکاری ملکیت کا نظریہ زیر بحث آیا۔ تو اقبال نے کہا۔" اس نظریہ پر سب سے پہلے جس یورپین مصنف نے تبصرہ

کیا وہ پیرن تھا۔ ۱۸۸۵ء میں اس نے پوری تحقیق و تفتیش کے بعد اس نظریہ کو بالکل مسترد کر دیا۔ ۱۸۳۰ء میں برگیر نے ہندوستان کے اندر ملکیت کے قانون و رواج کی پوری تحقیقات کی۔ یہ مصنف اپنی کتاب میں منوجی کے قوانین۔ اسلامی شریعت اور ہندوستان کے مختلف حصص۔ بنگال۔ مالوہ اور پنجاب وغیرہ کے متعلق رواجی پابندیوں کا تفصیل سے ذکر کرتا ہے۔ اور اس نتیجے پر پہنچتا ہے۔ کہ تاریخ ہند کے کسی دور میں بھی سلطنت زمین کی ملکیت کی مدعی نہیں ہوئی۔ زمین کا لگان معاف یا کم کرانے اور انکم ٹیکس اور معاملہ اراضی کا فرق بتانے اور زمین کو سرکاری ملکیت سے مستثنیٰ قرار دینے پر اقبال کی نہایت زور دار اور طویل تقریر تھی۔ تقریر کے دوران میں سر فضل حسین مرحوم رکن مالیہ سے بار بار خطاب ہوتا تھا۔ اس تقریر کے چند پُر لطف ٹکڑے پیش کئے جاتے ہیں۔

رکن مالیہ نے اپنے دلائل میں دو باتوں پر زور دیا (۱) صوبہ کی ترقی کے لئے روپیہ کی اشد ضرورت ہے۔ (۲) حکومت کیمیا گری نہیں جانتی ——— اس کے جواب میں اقبال نے کہا۔ "میری رائے میں حکومت کو اس وقت تک کیمیا سیکھنے کی ضرورت نہیں۔ جب تک کہ ملک کے تمام محنت کش کسان جن کا پسینہ مٹی کو سونا بنا دیتا ہے۔ اس کے قبضہ میں ہیں"۔ وزیر مال نے کہا۔ "کہ مالگذاری کا یہی طریقہ جاری رکھا جائیگا۔

یا اُسے بالکل چھوڑ دیا جائے گا۔ اس کے سوا تیسرا رستہ کوئی نظر نہیں آتا"۔ــــــــ اقبال نے جواب میں کہا "اگر آپ یہ تسلیم کر لیں۔ کہ مالگذاری عائد کرنے کا یہ طریق غیر منصفانہ ہے۔ تو اِس بے انصافی کو دُور کرنے کے لئے کچھ علاج شروع کیا جا سکتا ہے۔ اور اس کا علاج اقبال نے یہ بتایا۔ کہ ایک ایسے شخص کو جس کے پاس پانچ بیگہ سے زیادہ زمین نہیں۔ بشرطیکہ زمین ایسے رقبہ میں نہ ہو۔ جہاں آبپاشی نہیں کی جا سکتی۔ اور اس کی پیداوار کی تعداد بھی معین ہو۔ لگان معاف کر دینا چاہیئے۔"

وزیر مال نے یہ خوف اور احتمال پیش کیا۔ کہ یہ قرارداد مسودہ قانون مالگذاری کے شیرخوار بچے کی موت کا باعث بن جائے گی۔ اور ارکان کونسل بچہ کشی کے جرم کے مرتکب ہوں گے۔ اقبال نے کہا۔ آج کل جیسے منع حمل کی تدابیر پر عمل کیا جاتا ہے ــــ کسی ایسے بچے کا قتل کر دینا جس کے متعلق ہمیں علم ہو۔ کہ یہ بڑا ہو کر شریر ہو گا۔ نہایت معمولی بات ہے ــــ میری رائے میں یہ مطالبہ کہ پانچ بیگہ تک زمین کا مالیہ معاف کر دیا جائے۔ کچھ بہت زیادہ نہیں۔ $2\frac{1}{2}$ ایکڑ زمین والے شخص کا لگان معاف کرنے پر وزیر مالیات نے کہا۔ کہ یہ گناہ بے لذت ہو گا۔ اقبال نے کہا۔ کہ اگر آپ گناہِ بے لذت کا ارتکاب کریں گے۔ تو اتنا ضرور ثابت کر دیں گے۔ کہ آپ میں نقصان کا کچھ نہ کچھ احساس ہے۔

آخر میں اقبال نے کہا۔ کہ حکومت کو چاہیئے۔ کہ ان بیچاروں کے لئے کچھ کرے۔ جو اپنی زمین سے اپنے بال بچوں کا پیٹ پالنے کے لئے بھی پیداوار حاصل نہیں کر سکتے۔

کشمیر اور اقبال

اقبال مرحوم تمام دنیا کو اپنا وطن سمجھتے تھے۔ لیکن کشمیر کے ساتھ خاص محبت تھی۔ آل انڈیا مسلم کشمیری کانفرنس کے سیکرٹری بھی تھے۔ نواب سر سلیم اللہ خاں جی۔ سی۔ آئی۔ ای نواب ڈھاکہ جبکہ مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے جلسہ میں امرتسر آئے۔ تو کشمیریان پنجاب کی طرف سے اقبال ہی نے خیر مقدم کا ایڈریس پڑھکر سنایا تھا۔

مہاراجہ کشمیر نے کئی مرتبہ کشمیر آنے اور سرکاری مہمان ہونے کی دعوت دی۔ اور ایک دفعہ اقبال کشمیر گئے بھی۔ وہاں اپنی آنکھوں سے کشمیر کی جو حالت دیکھی۔ اس سے متاثر ہوئے۔ بغیر نہ رہ سکے۔ نشاط باغ کی سیر کے دوران میں بدنصیب کشمیریوں کی حالت کے متعلق لکھتے ہیں ؎

کشیرے[1] کہ با بندگی خو گرفتہ — بتے مے تراشد ز سنگِ مزارے
ضمیرش تہی از خیالِ بلندے — خودی ناشناسے ز خود شرمسارے
بریشم قبا خواجہ از محنتِ او — نصیب تنش جامۂ تار تارے

[1] کشمیری کشمیر کو کشیری بھی کہتے ہیں۔

نہ در دیدۂ او فروغ نگاہے
نہ در سینۂ او دل بیقرارے
ازاں مے نشاں قطرۂ بر کشیری
کہ خاکسترش افریند شرارے

شاہجہان کے عہد میں غنی ایک مشہور شاعر گزرا ہے جس کا سکہ ہندوستان و ایران تک بیٹھا ہوا ہے۔ وہ بادشاہ کے بلانے پر بھی اس کے دربار میں نہیں گیا۔ اس کا قاعدہ تھا کہ جب اپنے مکان پر ہوتا۔ تو دروازہ بند کر دیتا۔ اور جب باہر جاتا۔ تو دروازہ کھلا چھوڑ دیتا ——— کسی نے دریافت کیا۔ کہ اس کی کیا وجہ ہے۔ تو جواب دیا ——— متاع گراں تو میں ہی ہوں۔ جب میں گھر میں نہیں تو حفاظت کس کی ——— اس واقعہ کو اقبال نے کس خوبی سے نظم کیا ہے۔

غنی آں سخن گوئے بلبل سفیر
نوا سنج کشمیر مینو نظیر
چو اندر سرا بود دربستہ داشت
چو رفت از سرا تختہ را واگذاشت
یکے گفتش اے شاعر دل پسے
عجب دارد از کار تو ہر کسے
بہ پاسخ چہ خوش گفت مرد فقیر
فقیرو بہ اقلیم معنی امیر
زمن آنچہ دیدند یاراں رواست
دریں خانہ جز من متاع کجاست
غنی تا نشیند بہ کاشانہ اش
متاع گراں است در خانہ اش
چواں محفل افروز در خانہ نیست
تہی تر ازیں ہیچ کاشانہ نیست

سیاحت کشمیر کے دوران میں ایک اور بھی نظم اقبال نے لکھی۔ جو اپنی روانی اور منظر افرینی کے لحاظ سے بے نظیر ہے ؎

رخت بہ کاشمر کشا کوہ و تل و دمن نگر — سبزہ جہاں جہاں ببین لالہ چمن چمن نگر
باد بہار موج موج مرغ بہار فوج فوج — صلصل و سار زوج زوج بر سر نارون نگر
تا نہ فتد بہ زینتش چشم سپہر فتنہ باز — بستہ بہ چہرۂ زمیں برقع نسترن نگر
لالہ زخاک بر دمید موج بہ آب جو تپید — خاک شرر شرر ببیں آب شکن شکن نگر
زخمہ بہ تار ساز زن بادہ بہ ساتگین بریز — قافلۂ بہار را انجمن انجمن نگر
دخترکے برہمنے لالہ رخے سمن برے — چشم بروئے او کشا باز بہ خویشتن نگر

اقبال نے اہل کشمیر اور کشمیر کے متعلق جو رباعیاں کہی ہیں۔ وہ ان کے مطبوعہ کلام میں نہیں۔ اس لئے ہم یہاں درج کرتے ہیں ؎

کہکشاں میں آکے اختر بل گئے — اک لڑی میں آکے گوہر بل گئے
واہ وا کیا محفلِ احباب ہے — ہم وطن غربت میں آکر مل گئے

موتی عدن سے لعل ہوا ہے یمن سے دور — یا نافہ غزال ہوا ہے ختن سے دور
ہندوستاں میں آئے ہیں کشمیر چھوڑ کر — بلبل نے آشیانہ بنایا چمن سے دور

سامنے ایسے گلستاں کے کبھی گر نکلے — جیب خجلت سے سر طور نہ باہر نکلے
ہے جو ہر لحظہ تجلّی گہہ مولائے جلیل — عرش و کشمیر کے اعداد برابر نکلے

اقبال اور سیاسیات

معلوم نہیں اقبال کے مخالفین کا اب کیا رنگ ہے۔ زندگی

ہیں تو وہ اس کو سیاسی میدان میں دیکھنا پسند ہی نہ کرتے تھے۔ بلکہ ہمیشہ یہی کہا گیا۔ کہ اس کے قول و عمل میں بہت تفاوت ہے۔ جیسا کہ بمبئی کرانیکل کے نمائندے نے خود اقبال مرحوم سے ایک انٹرویو میں کہہ دیا تھا۔ یہ درست ہے۔ کہ اس قسم کے لوگوں کے دل اقبال کو سیاسی میدان میں دیکھ کر جل جائیں گے۔ مگر میں حقیقت کے اظہار سے باز نہیں رہ سکتا۔

تمام معترضین کو یاد رکھنا چاہیئے۔ کہ قول کے مطابق قوموں کو عمل پر اُبھارنے والا قول بھی حسن عمل سے کم نہیں ہوتا۔ دنیا کے عظیم الشان مصلحین کی زندگی کے واقعات کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ ان میں سے اکثر ہنگامہ ہائے حیات سے دور رہنے کے باوجود اپنی اپنی جماعتوں میں زندگی پیدا کرنے کا بہت بڑا سبب بنے رہے۔ والٹر۔ روسو۔ گوئٹے یہ تینوں ہستیاں یورپ کے مجتہدین فکر میں شمار ہوتی ہیں۔ انہی کے خیالات کی بدولت فرانس اور جرمنی میں عظیم انقلابات رونما ہوئے۔ لیکن یہ تمام انقلابات ان کی تحریروں کا نتیجہ تھے۔ گوئٹے امن و امان میں رہنے کی عادت کو پسند کرتا تھا۔ اور وطن پرستی کا مخالف تھا۔ ایک سوانح نگار اس کے متعلق لکھتا ہے۔

"وہ امن کا فرزند تھا۔ اور اپنی زندگی کے کسی حصے میں بھی وہ ہنگاموں میں آنے کو پسند نہ کرتا تھا۔ وہ ریفارمیشن کو بہت بُرا

سمجھتا تھا۔ کیونکہ اس کے ذریعہ ارتقار کا پُرامن عمل رُک گیا۔ گوئٹے ہنگامی واقعات سے بہت کم متاثر ہوتا تھا۔ اور بیرونی زندگی کے حوادث سے چنداں سروکار نہ رکھتا تھا۔ اس کا فکر کرنے والا دماغ حیات کی اندرونی گہرائیوں تک جانیکا شیدا تھا...... اس کے خلاف یہ اعتراض پیش کرنا۔ کہ وہ سیاست کے ہنگامی واقعات میں حصّہ کیوں نہ لیتا تھا۔ اس بات کے مترادف ہے کہ ہم وزیر اعظم کو یونانی آرٹ اور علوم میں دلچسپی نہ لینے کیلئے مطعون کریں۔ یہ کہا گیا ہے۔ کہ گوئٹے سیاسیات سے الگ ہوکر آرٹ اور سائینس کے میدان میں پناہ گزیں اس لئے ہوا کہ اس میں دوسروں کے معاملات میں حصہ لینے کے بجائے خودغرضی کا مادہ بہت زیادہ تھا۔ لیکن یہ اعتراض بیہودہ اور بے سرو پا ہے۔

کیونکہ خود سیاسیات بھی ایک خود غرضی کا ہی کھیل ہے ...."

اقبال مرحوم نے ہمیشہ اپنے آپ کو گوئٹے کا ہم مشرب قرار دیا۔ ہنگامی حوادث کے معاملات میں یہ دونوں یکساں نظر آتے ہیں۔ لیکن اقبال نے ایک مُصلح اور مسلمان کی حیثیت سے دنیا کی سیاسی خامیوں کی اصلاح کرنے میں کبھی دریغ نہ کیا۔ اس نے فطرت اللہ کی سیاسی حقیقتوں کی طرف متوجہ کرتے

کی ہمیشہ کوشش کی۔ اس لئے ہم اس کو کبھی سیاسیات سے الگ نہیں کر سکتے۔ وہ اسلام کا فرزند تھا۔ اور جس دور میں وہ پیدا ہوا۔ اس کا یہ عالم تھا۔ کہ اسلام کی تمام سیاسی قوتیں رُو بہ انحطاط ہو رہی تھیں۔ اہل اسلام کے قلوب ہر روز نئے نئے صدموں سے پاش پاش ہوتے جا رہے تھے۔ ان کو کہیں کوئی دوست نظر نہ آتا تھا۔ وطنی اور غیر وطنی دشمنوں کے حملے اُن کے حوصلوں کو پست کر چکے تھے۔ اور کوئی ایسا آدمی ان کو نظر نہ آتا تھا۔ جو پھر زندگی کے خون کو اُن کی رگوں میں حرکت دیتا۔ غالب کی آنکھوں کے سامنے دلی برباد ہو گئی۔ لیکن وہ صرف ؎

اے تازہ واردانِ بساطِ ہوائے دل

کہکر خاموش ہو گیا۔ اس لئے کہ وقت کا اقتضا یہی تھا۔ حالی نے مسلمانوں کے ذہنی امراض کا علاج کیا ——— شبلی کے نغموں نے جمود و سکون کی دنیا میں جنبش پیدا کی۔ لیکن انہوں نے اپنے لئے تاریخ کا میدان انتخاب کر لیا۔ اور اس کی وجہ صرف یہ تھی۔ کہ قدرت یہ کام سیالکوٹ کے ایک روشن دماغ فلسفی سے لینا چاہتی تھی۔ چنانچہ یہی ہُوا۔ یہی وجہ ہے۔ کہ ہندوستان کی سیاسی جدوجہد کے بڑے بڑے علمبردار اقبال کے کلام سے متاثر اور اس کے ممنون ہیں۔

اقبال کے خلاف ایک زبردست اعتراض یہ بھی ہے۔

کہ وہ ہمیشہ اپنا مسلک تبدیل کرتا رہتا تھا۔ اور ہر ہفتہ کے بعد اس کے خیالات میں ایک زبردست انقلاب پیدا ہو جاتا تھا۔ کبھی تو وہ یہ کہتا تھا کہ ؎

اُجاڑا ہے تمیزِ ملت و آئیں نے قوموں کو
مرے اہلِ وطن کے دل میں کچھ فکرِ وطن بھی ہے

سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا
ہم بلبلیں ہیں اسکی یہ گلستاں ہمارا
مذہب نہیں سکھاتا آپس میں بیر رکھنا
ہندی ہیں ہم وطن ہے ہندوستاں ہمارا

اور کبھی دیر و حرم کی قیود سے آزاد ہو کر نیا شوالہ تعمیر کرنے کی خواہش پیدا ہوتی تھی۔ تاکہ خود اس میں پُجاری بن کر بیٹھے اور دوسروں کو بھی اس نوساختہ صنم کدہ میں آنے کی دعوت عام ہو۔ مگر کبھی یہ عالم ہوتا تھا۔ کہ وطنیت کو لعنت قرار دیکر کہہ اُٹھتا تھا ؎

اقوام میں مخلوقِ خدا بٹتی ہے اُس سے
قومیت اسلام کی جڑ کٹتی ہے اس سے

کبھی سرمایہ و محنت کی جنگ چھڑتی۔ تو مزدور کی حمایت میں آواز بلند کرتا۔ اور مزدور کو "سرمایہ دار حیلہ گر" کی عیاریوں سے آگاہ کرتا۔

مگر معترضین نے کبھی غور و فکر سے کام لینے کی تکلیف گوارا نہ کی۔ اصل بات یہ ہے۔ کہ اقبال کے حساس جذبات قانونِ ارتقا

کے تابع رہے ہیں۔ شاعر اور پیغمبر میں بہت ہی خفیف سا فرق ہوتا ہے۔ پیغمبر کو اسرارِ فطرت سے قبل از وقت آگاہی ہو جاتی ہے۔ لیکن شاعر واقعات اور حالات سے متاثر ہوتا ہے۔ اس کے نتائج اور استنباط کے لئے ایک موجود فی الخارج بستی کی ضرورت ہے۔ البتہ شاعر کا جذبۂ احساس عوام الناس کی نسبت زیادہ تیز ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے۔ کہ اقبال یورپ جانے سے پہلے وطنیت کے جذبوں سے بہت زیادہ مغلوب تھا۔ لیکن مغربی زندگی مغربی جمہوریت کے عیوب مشاہدہ کی بنا پر اسکے لئے نمایاں ہوتے گئے۔ تفریح کی دلبستگی لاکھ باعث فریب ہو۔ لیکن حقیقت بیں نگاہیں اگر پس پردہ بھی نظر اُٹھا کر دیکھتی ہیں۔ تو انہیں سب کچھ نظر آجاتا ہے۔ نیشنلزم کی ظاہریت کتنی ہی دلفریب کیوں نہ ہو۔ لیکن دول یورپ کی ہوس کاریاں اور نیشنلزم سے متاثر اقوام کی تباہ کاریاں ایک حساس قلب کے لئے ناقابلِ برداشت ہیں۔ اقبال نے جب نیشنلزم کے پہلے چشمے کو اپنی حقیقت شناس آنکھوں سے دیکھا۔ تو اس کا پانی گدلا اور بدبودار معلوم ہوا۔ اس کی نگاہیں ایک بلندترین منتہا کی جانب اُٹھیں۔ اور وہ اسلام کا پرستار حقیقی بن گیا۔

اقبال کی ایک خصوصیت یہ ہے۔ کہ وہ اپنے سیاسی افکار میں بُت شکن کی حیثیت سے نظر آتا ہے۔ وہ ان خیالات کے

طلسم توڑتا ہے۔ جو اوہام اور خرافات کا گنجینہ ہوں۔ اور جن کی بدولت انسانی ذہن مکدر ہو رہے ہیں۔ اس میدان میں اس کو یہ پرواہ نہیں ہوتی۔ کہ اس کے مقابلہ میں کون ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے۔ کہ وہ تمام افکار و اعمال کو اسلام یا فطرۃ اللہ کے معیار اور نکتۂ نگاہ سے دیکھنا چاہتا ہے ——— اور اس یقین و ایمان کے لئے کہ فطرۃ اللہ میں اسلام ہے۔ فلسفیانہ اور حکیمانہ دلائل و براہین بھی اپنے پاس رکھتا ہے۔ حکومت کے مختلف طریقوں میں اسلامی طریق حکومت کا انتخاب۔ جہاد کی حقیقی غرض و غایت اور اس کی ضرورت نیشنلزم کے بجائے انٹرنیشنلزم کا عقیدہ۔ عقل و عشق کی جنگ میں عشق کی گیرائی اور قوت تسخیر میں کامل یقین۔ غرض اس طرح کے سینکڑوں مسائل ہیں۔ جن میں ہمیں اقبال یورپ کے منتخب فلسفیوں اور حکیموں کے سامنے صف آرا نظر آتا ہے۔ اقبال کسی سے مرعوب نہیں ہوتا۔ میزنی۔ کارل مارکس۔ نیٹشے۔ روسو برگسان اور ہیگل کے نام اس پر کوئی ہیبت طاری نہیں کر سکتے۔ وہ ان میں سے بعض کے ساتھ اتحاد کرتا ہے۔ اور انہی کو ساتھ لے کر مخالفین پر حملہ کر دیتا ہے۔ مگر یہ یاد رہے۔ کہ وہ صرف "فطرۃ اللہ" کے معیار کا مالک ہے۔

یورپ کے علما و فضلا میں طرز حکومت کا اہم مسئلہ اس

وقت زیر بحث ہے۔ اس میں دو گروہ ہیں۔ ایک گروہ "جمہوریت" کو بہترین طرزِ حکومت قرار دیتا ہے۔ اور اس عقیدے کے لئے اس کے پاس کافی دلائل موجود ہیں۔ دوسرا گروہ جمہوریت کو استبداد کی ایک نئی شکل قرار دیتا ہے۔ اقبال اس دوسرے گروہ کے ساتھ متفق ہے۔

ہے وہی سازِ کہن مغرب کا جمہوری نظام — جس کے پردوں میں نہیں غیر از نوائے قیصری
دیو استبداد جمہوری قبا میں پائے کوب — تو سمجھتا ہے یہ آزادی کی ہے نیلم پری
مجلسِ آئین و اصلاح و رعایات و حقوق — طب مغرب میں مزے میٹھے اثر خواب آوری

اس سراب رنگ و بو کو گلستاں سمجھا ہے تو
آہ اے ناداں قفس کو آشیاں سمجھا ہے تو

تاریخ کی ورق گردانی کر لیجئے۔ ابتدائے آفرینش سے اب تک کوئی جمہوریت حقیقی صورت میں قائم نہ ہو سکی۔ افلاطون نے ری پبلک کا خاکہ کھینچا ہے۔ لیکن اس کو صرف خیال و تمثیل کی حیثیت حاصل ہو کر رہ گئی۔ اور دنیائے عمل میں اس کے لئے کوئی مقام نہیں۔ دنیا میں آج تک مساوات۔ آئین اور برادری کی جتنی آوازیں اٹھیں۔ وہ نہایت کمزور طبقوں کی آوازیں تھیں۔ جو غلبہ حاصل کرنے کے ساتھ ہی استبداد کی جانب مائل ہو گئیں۔ فرانس کا انقلاب نہایت دل خوش کن دعا دی۔ اور عام پسند اصولوں کے اعلان کے ساتھ شروع ہوا

تھا۔ لیکن اہل دُنیا نے دیکھ لیا۔ کہ نہایت قلیل عرصہ میں وہ جمہوریت اور آئین پسندی فطرتِ انسانی کے سامنے دب کر رہ گئی۔ خود اس زمانے میں اٹلی۔ ترکی۔ روس اور دوسرے ممالک میں اس فطری حقیقت کا اعادہ ہوا۔

جمہوریت بہترین طریقِ حکومت نہیں۔ اس لیے کہ اس کی بدولت ناقابل اداروں کا رواج عام ہو رہا ہے۔ ہر شخص بآسانی سمجھ سکتا ہے۔ کہ تمام مخلوق یکساں طور پر پبلک امور کو سمجھنے کی اہلیت نہیں رکھتی۔ اور اس نااہلی کا اثر ان کے انتخاب پر پڑتا ہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے۔ کہ وہ لوگ انتخاب میں آجاتے ہیں۔ جن میں قابلیت تو ہوتی نہیں۔ البتہ صرف ووٹروں کو خوش رکھ سکتے ہیں۔ یہ طریقہ حکمرانی انتظام امورِ عامہ کے لیے مضرت رساں ہوتا ہے۔ جمہوریت کے ماتحت جو تہذیب فروغ پذیر ہوتی ہے۔ وہ اعلیٰ نہیں ہوتی۔ اس کے علاوہ قوم میں غیر معمولی قابلیت کے لوگ پیدا کرنے کی قوت پیدا نہیں ہو سکتی۔ جمہوریت میں اپنی ترقی اور ذاتی منفعت کا جذبہ بہت ترقی پذیر ہو جاتا ہے۔ ان تمام دلائل کی نسبت موثر دلیل اقبال کی ہے ؎

گریز از طرزِ جمہوری غلام پختہ کارے شو
کہ از مغز دو صد خر فکرِ انسانی نمی آید

روسو کا قول ہے۔ کہ جمہوری طرز حکومت کی کامیابی صرف ایک

ہی صورت سے ہو سکتی ہے۔ کہ تمام پبلک قابل اور تعلیم یافتہ بن جائے۔ چنانچہ اسی سلسلہ میں وہ لکھتا ہے "اگر دنیا میں دیوتاؤں کی قوم ہوتی۔ تو اس کے لئے جمہوری طرز حکومت بہت مناسب ہوتی۔ لیکن ہم انسانوں کے لئے ایسا "مکمل" نظام کچھ سازگار نہیں۔ روسو کہتا ہے۔ کہ دنیا میں نہ کوئی جمہوریت قائم ہوئی ہے۔ نہ اب ہو سکے گی۔ یہ قانون قدرت کے خلاف ہے۔ کہ اکثریت حکمرانی کرے۔ اور اقلیت محکوم رہے۔ دنیا میں کوئی طرز حکومت خانہ جنگیوں۔ سازشوں اور فرقہ بندیوں کا اتنا بڑا مرکز نہیں ہوئی۔ جتنا کہ جمہوریت میں اس کے امکانات موجود ہیں۔

اقبال کا عقیدہ ہے۔ کہ انسان کو محکوم رہنے کی عادت ہے۔ اور انسانی جماعتیں اپنے لئے خود نئے نئے بت تراش لیتی ہیں۔ موسولینی اور قیصر ولیم کے مکالمے میں اسی طرف اشارہ کیا ہے سے

نماند ناز شیریں بے خریدار اگر خسرو نباشد کوہکن ہست

روسو کا قول ہے۔ کہ ری پبلک کی صحیح بنیاد نیکی ہے۔ اور اقبال اس معاملہ میں روسو کی تائید کرتا ہے۔ اس لئے۔ کہ یہی فطرت اللہ کا منشا ہے۔ آج کل یورپ کی سیاست اور تمدن کی بنیاد جن غیر اخلاق قوانین پر منحصر ہے۔ اقبال ان کا سخت مخالف ہے۔ اور دنیا کو اس سے روگردانی کی تعلیم دیتے

ہوئے اسلام یا فطرۃ اللہ کی تعلیم کی طرف متوجہ کرتا ہے۔ غیر اخلاق قوانین کے خلاف۔ محبت۔ خدمت خلق۔ ایمان محکم اور یقین کامل کی فتوحات و برکات کا وہ سبق دیتا ہے چنانچہ ملاحظہ ہو ؎

یہی مقصودِ فطرت ہے یہی رمزِ مسلمانی | اخوت کی جہانگیری محبت کی فراوانی
گماں آبادِ ہستی میں یقیں مردِ مسلماں کا | بیاباں کی شبِ تاریک میں قندیلِ رہبانی
ثباتِ زندگی ایمانِ محکم سے ہے دُنیا میں | کہ المانی سے بھی پائندہ تر نکلا ہے تورانی

ولایت، بادشاہی، علمِ اشیا کی جہانگیری | یہ سب کیا ہیں فقط اک نکتۂ ایماں کی تفسیریں
یقیں محکم، عمل پیہم، محبت فاتحِ عالم | جہادِ زندگانی میں ہیں یہ مردوں کی شمشیریں

اقبال بین الاقوامیت کے عقیدہ میں بہت زیادہ محکم ہے۔ یہی وہ عقیدہ ہے۔ جو موجودہ بین الاقوامی رجحانات سے صدیوں پہلے اسلام نے قوموں کے اندر پیدا کر رکھا تھا۔ اقبال کے مذہب میں نیشنلزم سے بڑھ کر کوئی گناہ نہیں۔ جو یقین کے ساتھ کہتا ہے۔ کہ قومیت اور وطنیت اسلام کی عالمگیر بین الملی اخوت کی روح کے منافی ہے ؎

اپنی ملت پر قیاس اقوامِ مغرب سے نہ کر | خاص ہے ترکیب میں قومِ رسولِ ہاشمی
ان کی جمعیت کا ہے ملک و نسب پر انحصار | قوتِ مذہب سے مستحکم ہے جمعیت تری

دامن دیں ہاتھ سے چھوٹا تو جمعیت کہاں | اور جمعیت ہوئی رخصت تو ملت بھی گئی

ہو کر لیگا امتیاز رنگ و بو مٹ جائیگا | ترک خرگاہی ہو یا اعرابی والا گہر
نسل اگر مسلم کی مذہب پر مقدم ہو گئی | اڑ گیا دنیا سے تو مانند خاک رہگذر

نہ افغانیم و نے ترک و تتاریم | چمن زادیم و از یک شاخساریم
تمیز رنگ و بو بر ما حرام است | کہ ما پروردۂ یک نو بہاریم

بتان رنگ و خوں کو توڑ کر ملت میں گم ہو جا | نہ تورانی رہے باقی نہ ایرانی نہ افغانی

تو اے کودک نشیمن خود را ادب کن | مسلمان زادۂ! ترک نسب کن
برنگ احمر و خون و رگ و پوست | عرب زاد اگر ترک عرب کن

اگرچہ زادۂ بندم فروغ چشم من است | ز خاک پاک بخارا و کابل و تبریز

سوشلزم کے متعلق کہا جا چکا ہے۔ کہ اقبال کا رویہ ہمدردانہ ہے۔ اس نے اپنے بیشمار اشعار میں مزدوروں کی حالت زار اور سرمایہ داروں کے مظالم کا تذکرہ کیا ہے ؎

بندۂ مزدور کو جا کر مرا پیغام دے | خضر کا پیغام کیا ہے یہ پیام کائنات

اے کہ تجھ کو کھا گیا سرمایہ دارِ حیلہ گر
شاخِ آہو پر رہی صدیوں تلک تیری برات

دستِ دولت آفریں کو مزد یوں ملتی رہی
اہلِ ثروت جیسے دیتے ہیں غریبوں کو زکات

نسل، قومیت، کلیسا، سلطنت، تہذیب، رنگ
خواجگی نے خوب چن چن کر بنائے مسکرات

اٹھ کہ اب بزمِ جہاں کا اور ہی انداز ہے
مشرق و مغرب میں تیرے دور کا آغاز ہے

کر بلبل و طاؤس کی تقلید سے توبہ

کر بُکِ ناداں طوافِ شمع سے آزاد ہو
اپنی فطرت کے تجلی زار سے آباد ہو

مغربی تحریکوں کے متعلق اقبال کو جو بدظنی ہے۔ اس سے متاثر ہو کر وہ موسیولینن کے دعاوی کا یوں ابطال کرتا ہے۔ جو قیصر ولیم کی زبان سے ادا ہوتا ہے۔ اقبال کا ہمیشہ سے دستور رہا ہے۔ کہ جب بھی وہ کسی حریف کے مقابل میں آیا۔ تو ایک تیسرے حریف، کو شاہدانہ حیثیت میں اپنے ہمراہ لے کر آتا ہے۔ چنانچہ ملاحظہ ہو سے۔

گناہ و عشوہ و نازِ بتاں چیست
طواف اندر سرشتِ برہمن ہست
دما دم نو خدا وندان تراشد
کہ بیزار از خدایانِ کہن ہست

اگر تاج کئی جمہور پوشد
ہمہ ہنگامہ ہا در انجمن ہست
ہوس اندر دل آدم نہ میرد
ہمہ آتش میان مرغ بست
نماند نار شیریں بے خریدار
اگر خسرو نباشد کوہکن ہست

شاعر اسلام

ٹینی سن۔ ملکی عصبیت کا علمبردار۔ انگلینڈ کا بہترین شاعر ہے۔
براؤننگ۔ آرٹ کا سچا ترجمان شعر کی دلہن کو حسن کی اداؤں سے رنگین کرتا ہے۔ جن کی پرستش زمان و مکان کی قید سے بالاتر ہے۔ اور وہ سخن کی محفل میں ارٹ کا صحیح نمائندہ ہے۔

ورڈسورتھ۔ نیچر کا شیدائی فطرت کی زبان میں القائے تصور کے بھید کھولتا ہے۔ اور وہ انہی فضاؤں کا سب سے زیادہ رنگین طائر ہے۔

کیٹس۔ حسن کی تعریف میں حسین نغمے گانے والا۔ خیال کے پردے میں حسن کی وہ جمال آگیں تصویر کھینچنے والا جس کی آب وتاب سے دل کی دنیا منور ہو جاتی ہے۔ وہ

سچا حسن پرست ہے۔

بائرن۔ وہ بائرن جس کے پیمانۂ دل میں حوادث کی آتش سیال موجزن ہے۔ وہ جہانِ شعر کا نپولین اعظم وہ انقلاباتِ کائنات کے تذکروں سے شعر کی دنیا میں ہلچل ڈال دینے والا۔ اور سچا حریت پسند۔

سکاٹ۔ انگلستان کی شجاعتِ کہنہ کا مصور۔ جنگ و جدل کی دنیا کا سب سے بڑا نظر باز۔

ملٹن۔ فردوس کی گمشدگی و بازگشتگی کا داستان گو۔ اس کی شوکت اس کا وقار مسلم ہے۔

شیکسپیر۔ صاحب نظر۔ صاحب دل۔ مزاج میں فرد سنجیدگی میں بے مثال۔ محفلوں کی رنگینیاں۔ آنکھوں میں چھپا کر لے آنے والا۔ بیابانوں کی وحشت اپنے دل کی گہرائیوں میں گم کر لینے والا۔ جس کی آنکھوں پر عرصۂ جنگ کے صدہا منظر عریاں ہیں۔ اس کے دل میں انسانی بیقراریوں کا نازک سے نازک احساس بھی موجود ہے۔ شاہوں کی کمزوریوں سے باخبر۔ غریبوں کی قوت کا راز دار۔ کائنات کا محرم۔ مزاج انسان کا نبض شناس۔ غرض دنیا کا سب سے بڑا کردار نگار ہے۔

گیٹے۔ اپنے عہد کی حشر آفرین فضائیں فلسفے اور خیال کی شعاعوں سے روشن کرنے والا۔

شکسپیر کا ہم عصر المانیوں میں زندگی کی لہر دوڑانے والا۔ یورپ کے ظلمت کدہ کا تابندہ ستارہ جس میں اسلام کا پرتو نظر آتا ہے۔

غالب ——— جہان آباد کا نغز گو شاعر۔ محشر کدۂ دل کے ہنگاموں کو نوکِ زبان پر رقصاں کر دینے والا۔ رازِ طلسمِ حیات کو جنتِ نظر بنا دینے والا۔ اور زندگی کے راگ کو فردوسِ گوش کی حیثیت دینے والا۔ اس کی شیریں کہانیاں اس دور کی ہیں۔ جب ہماری ہزار سالہ عظمت کے لب پر آخری ہچکی تھی۔ وہ غالب جو آرزوؤں کے خون پر دل خون کر دیتا ہے۔

ٹیگور۔ وحدانیت کے گیت گانے والا۔ سکونِ ابدی کا رسیا۔ جس کا ترنم دکھ بھری زندگی کو لوری دیتا ہے۔

شلر۔ منتہائے خیال تک پرواز کرنے والا۔ وہ جنون کو فرزانگی سمجھتا ہے۔ اس کا شمار ہمیشہ وسعتِ دل رکھنے والوں میں ہوگا۔

ڈانٹے حسن کی پرستش پر مرمٹنے والا۔ تصور کی بازو میں آسمانوں کی سیر کرنے والا۔ جس کے جذبۂ عشق نے ایک گمنام عورت کو زندۂ جاوید بنا ڈالا۔ اس کا تصور ہمیشہ قابلِ عظمت ہے۔

ہومر۔ جہانِ شعر کا باوا آدم۔ فردوسِ جناں کا مکین۔ جو محاربات کی تصویر کھینچکر دلوں کی دنیا متزلزل کر دیتا ہے۔

رومی۔ مادرِ ایران کو اپنے اس فرزند پر فخر ہے۔

عزیز لکھنوی۔ روایات نقلی کے طلسم کو توڑنے والا۔ فلسفۂ حیات کا ترجمان۔ درد کی دنیا کا مالک۔ جس کے دارالعلوم سے نکلے ہوئے شاعر ہمیشہ دنیا کو شراب روحانیت پلاتے رہینگے۔

اقبال۔ اقبال بیک وقت قوم۔ وطن۔ آرٹ۔ فلسفہ۔ فطرت حسن۔ شجاعت۔ انقلاب۔ حریت۔ تصوف سب کچھ پیش کرتا ہے۔ وہ ان سب سے فزوں تر ہے۔ اس لئے کہ وہ شاعر اسلام ہے۔ اقبال دنیا کے سب شاعروں سے بلند۔ اور پائندہ اور ہمیشہ ہمیشہ زندہ رہنے والا شاعر ہے۔

اقبال کی ایک غیر معروف رباعی

کتنا مبارک تھا۔ انجمن حمایت اسلام کا وہ سالانہ جلسہ۔ جس میں ڈاکٹر حافظ نذیر احمد۔ مولانا حالی۔ مرزا ارشد اور مولوی عبدالمجید دہلوی آخری مرتبہ شریک ہوئے۔ اس جلسہ کے صدر میاں محمد شاہ دین ہمایوں مرحوم تھے۔

سر محمد شفیع مرحوم۔ سر فضل حسین مرحوم۔ سر عبدالقادر۔ مولانا ابوالکلام آزاد خواجہ حسن نظامی جلسہ میں موجود تھے۔

عصر کے قریب ایک اجلاس میں پنجاب کے ایک شاعر نے ایک نظم شروع کی۔ دستور یہ تھا۔ کہ جب کوئی شاعر کوئی نظم پڑھتا۔ تو اس کی داد انجمن کو عطیہ کی صورت میں دی جاتی۔

چنانچہ اس شاعر کے ایک شعر پر حالی مرحوم نے دس روپے کا ایک نوٹ دیا۔ جلسہ گاہ نعرۂ تحسین۔ تالیوں اور اسی قسم کے دیگر مظاہروں سے گونج اٹھی۔ تھوڑی دیر کے بعد مولانا حالی مرحوم کی باری آئی۔ مگر پیرانہ سالی کی وجہ سے ان کی آواز بہت خفیف ہو چکی تھی۔ اور دور کا تو کیا ذکر ہے۔ قریب کے لوگ بھی نہ سن سکتے تھے۔ لہذا جو کان مدت سے اس آواز کو سننے کے لئے بیچین تھے۔ وہ مولانا حالی کی آواز کا رنگ دیکھ کر بیتاب ہو گئے۔ ہر شخص یہ چاہتا تھا۔ کہ خاموشی کا عالم ہو۔ اور اس کوشش میں وہ خود شور و غل کا موجب بن جاتا تھا۔ جب سر عبدالقادر نے یہ حال دیکھا۔ تو حاضرین سے مخاطب ہو کر کہا۔ آپ حضرات ان کلمات قدسیہ کو تبرکاً جس قدر سن سکتے ہیں۔ سن لیں۔ اور بعد میں شیخ محمد اقبال صاحب اس نظم کو پڑھکر سنائیں گے۔ یہ سن کر لوگ کسی حد تک مطمئن ہو گئے۔ چنانچہ جب حالی نے نظم ختم کی۔ تو اقبال گیلری سے اتر کر سٹیج پر آئے۔ اور حالی کی نظم پڑھنے سے پیشتر یہ رباعی سنائی ؎

مشہور زمانے میں ہے نام حالی
معمور مئے حق سے ہے جام حالی
میں کشور شعر کا نبی ہوں گویا
نازل ہے مرے لب پہ کلام حالی

ضربِ کلیم

شاعری ایک لطیف جذبہ ہے۔ جس کا تعلق براہ راست دل و دماغ جذبات و احساسات سے ہے۔ اس لئے نہایت ضروری ہے۔ کہ ہر شاعر کی شاعری کی معراج اس کے عین شباب میں ہو۔ جبکہ اس کے جذبات بے تابو۔ امنگیں جوان اور طبع رواں نہ رکنے والے بے پناہ سیلاب کی طرح موجزن ہو۔ اس کی وجہ یہ ہے۔ کہ جس قدر وہ اپنی عمر طبعی سے قریب ہوتا جائے گا۔ اتنا ہی پختہ کار تو ضرور ہوتا جائے گا۔ لیکن اس کے جذبات و احساسات میں تدریجی کمی واقع ہوتی جائیگی۔ بلکہ اکثر اوقات تو یہ دیکھا گیا ہے۔ کہ آخر عمر میں شاعر شعر کہنے سے معذور ہو جاتا ہے۔ لیکن اس کے برعکس اقبال زندگی کے ہر دور میں جوان نظر آتا ہے۔ اور اس کے کلام کا ہر حصہ شباب سے ہمکنار معلوم ہوتا ہے۔ آخری عمر کی تصنیف "ضربِ کلیم" ایسے شباب انگیز جذبات سے لبریز ہے۔ کہ اس کے مطالعہ سے کسی طرح اقبال کی ضعیف العمری کا اندازہ نہیں ہوتا۔ اور یہ حقیقی شاعر کی سب سے بڑی خصوصیت ہے۔

اقبال کا ہر شعر درسِ حریت کا حامل ہے۔ اور اپنے لطیف پیرائے میں "اعلانِ جنگ" کے عنوان سے یوں

بیان کرتا ہے ؎

نہیں قیام کی خوگر طبیعت آزاد
ہوائے سیر مثالِ نسیم پیدا کر
ہزار چشمے ترے سنگِ راہ سے پھوٹے
خودی میں ڈوب کے ضربِ کلیم پیدا کر

اقبال دورِ حاضرہ کے تعلیم یافتہ نوجوانوں کی تن آسانیوں پر سر دھنتا ہے۔ اور قوم کے جوان افراد کو مغربی قباؤں میں ملبوس دیکھ کر افسوس کرتا ہے۔ جب وہ دیکھتا ہے۔ کہ یہ نوجوان جن پر امیدوں کا انحصار ہے۔ مغربی شراب سے مدہوش ہو چکے ہیں۔ تو نشتر چبھو چبھو کر ان کو ہوش میں لانے کوشش کرتا ہے ؎

جبتک نہ زندگی کے حقائق پہ ہو نظر
تیرا زجاج ہو نہ سکے گا حریف سنگ
یہ زورِ دست و ضربتِ کاری کا ہے مقام
میدانِ جنگ میں نہ طلب کر نوائے چنگ
خونِ دل و جگر سے ہے سرمایۂ حیات
فطرت لہو ترنگ ہے غافل نہ جل ترنگ

لیکن جب وہ اپنی نصیحتوں کو بے نتیجہ دیکھتا ہے۔ تو اس کا دل درد سے بھر آتا ہے۔ قوم کے نوجوانوں کی بے حس زندگی

اور ناعاقبت اندیشی پر وہ تڑپ اُٹھتا ہے۔ اور بیقرار ہو کر یوں دُعا کرتا ہے ؎

خُدا تجھے کسی طوفان سے آشنا کر دے
کہ تیرے بحر کی موجوں میں اضطراب نہیں
تجھے کتاب سے ممکن نہیں فراغ کہ تو
کتاب میں ہے مگر صاحبِ کتاب نہیں

اقبال تہذیبِ مغرب کے پرستاروں پر بالکل اعتماد نہیں کرتا۔ وہ انکو مُردوں سے بدتر اور اغیار کی کٹ پتلی سمجھتا ہے ؎

گرچہ مکتب کا جواں زندہ نظر آتا ہے
مردہ ہے مانگے کا لایا ہے فرنگی سے نفس

لیکن فوراً ہی اقبال کو خیال آتا ہے۔ کہ سخت و سست کہنے سے نوجوان کی طبع نازک پر بار نہ ہو۔ لہذا فوراً اپنا رویہ بدل کر ناصحانہ صورت اختیار کر لیتا ہے ؎

نہیں ہنگامہ پیکار کے لائق وہ جواں
جو ہوا نالۂ مرغانِ چمن سے مدہوش
مجھ کو ڈر ہے کہ ہے طفلانہ طبیعت تیری
اور عیار ہیں یورپ کے شکر پارہ فروش

اقبال کے کلام کا اکثر حصّہ ایسا ہے۔ جس میں خودی کا سبق دیا گیا ہے۔ اس لئے کہ موجودہ ذلت و پستی کی بیماری کا علاج

اس حکیم کی تشخیص میں یہی ہے ؎

خودی ہے سرنہاں لا الٰہ الا اللہ
خودی ہے تیغ فساں لا الٰہ الا اللہ
یہ دور اپنے براہیم کی تلاش میں ہے
صنم کدہ ہے جہاں لا الٰہ الا اللہ
یہ نغمہ فصلِ گل و لالہ کا نہیں پابند
بہار ہو کہ خزاں لا الٰہ الا اللہ
اگرچہ بُت ہیں جماعت کی آستینوں میں
مجھے ہے حکم اذاں لا الٰہ الا اللہ

اقبال کے خیال میں تقدیر پر شاکر رہنا۔ اور راہبی نہایت بزدلی اور پست ہمتی ہے۔ اس سلسلہ میں ملاؤں کی من گھڑت قرآنی تفسیر کو لغو لایعنی اور آسمانی کتاب پر وہ بہتان سمجھتا ہے۔ اور ان تمام باتوں کا سبب غلامانہ ذہنیت کو قرار دیتا ہے ؎

اسی قرآن میں ہے اب ترکِ جہاں کی تعلیم
جس نے مومن کو بنایا مہ و پرویں کا امیر
تن بہ تقدیر ہے آج ان کے عمل کا انداز
تھی نہاں جن کے ارادوں میں خدا کی تقدیر
تھا جو ناخوب بتدریج وہی خوب ہوا
کہ غلامی میں بدل جاتا ہے قوموں کا ضمیر

دوسری جگہ مسلمانوں کی بے حسی اور غلامانہ ذہنیت کا یوں ماتم کیا جاتا ہے ؎

خود بدلتے نہیں قرآں کو بدل دیتے ہیں
ہوئے کس درجہ فقیہانِ حرم بے توفیق
ان غلاموں کا یہ مسلک ہے کہ ناقص ہے کتاب
کہ سکھاتی نہیں مومن کو غلامی کے طریق

اقبال جب اپنے تجویز کئے ہوئے نسخے قوم کے معالجہ میں ناکام دیکھتا ہے۔ تو قوم کی غلامانہ ذہنیت کا خود اسے شکوہ کرتا ہے ؎

لیکن مجھے پیدا کیا اس دیس میں تو نے
جس دیس کے بندے ہیں غلامی پہ رضامند

اقبال کے خیال میں ملا کا مسجد میں آزادی کے ساتھ سجدہ کرلینا آزادی نہیں۔ بلکہ وہ اسے ننگِ مسلمانی سمجھتا ہے ؎

ملا کو جو مسجد میں ہے سجدے کی اجازت
ناداں یہ سمجھتا ہے کہ اسلام ہے آزاد

اقبال خودی کو اتنا بلند سمجھتا ہے۔ کہ جس کی خود رب العزت بھی قدر کرتا ہے۔ اس کے نزدیک ترکِ خودی انتہائی پستی ہے۔ چنانچہ ایک مکالمہ میں ذات باری کی طرف سے ابلیس سے استفسار ہوتا ہے۔ کہ تجھے آدم کو سجدہ کرنے سے کس

چیز نے باز رکھا۔ ابلیس کہتا ہے۔ تیری مشیت ہی میں میرا سجود نہ تھا۔ ورنہ مجھے یہ جرأت کیونکر ہو سکتی تھی۔ جناب بالعزت ابلیس سے فرشتوں کی طرف دیکھ کر کہتے ہیں ؎

پستیٔ فطرت نے سکھلائی ہے یہ صحبت اُسے
کہتا ہے تیری مشیت میں نہ تھا میرا سجود
دے رہا ہے اپنی آزادی کو مجبوری کا نام
ظالم اپنے شعلۂ سوزاں کو خود کہتا ہے دود

اقبال یہ بھی سمجھتا تھا۔ کہ اس کا درسِ آزادی اغیار کی نگاہوں میں کھٹکتا ہے۔ لیکن ان کا بس نہیں چلتا۔ ورنہ زبان بندی کر دی جائے ؎

مری خودی بھی سزا کی ہے مستحق لیکن
زمانہ دار و رسن کی تلاش میں ہے ابھی

دیدہ دلیری اسلام کے بے نظیر شاعر کی ملاحظہ ہو۔

تری حریف ہے یارب سیاستِ افرنگ
مگر ہیں اس کے پجاری فقط امیر و رئیس
بنایا ایک ہی ابلیس آگ سے تو نے
بنائے خاک سے اس نے دو صد ہزار ابلیس

مسولینی کی ترجمانی کرتے ہوئے اقبال تہذیب مغرب کی نقاب کشائی کرتا ہے۔ اور اہلِ فرنگ کی فطرت کا فوٹو ایسے

انداز میں پیش کیا جاتا ہے۔ جو اپنی آپ ہی نظیر ہے ؎

کیا زمانے سے نرالا ہے مسولینی کا جرم
پہلے سے بگڑا ہوا ہے اہل یورپ کا دماغ
میرے سودائے ملوکیت کو ٹھکراتے ہو تم
تم نے کیا توڑے نہیں کمزور قوموں کے ایاج
تم نے لوٹے بے نوا صحرا نشینوں کے خیام
تم نے لوٹی کشت دہقاں تم نے لوٹے تخت و تاج
پردۂ تہذیب میں غارت گری آدم کشی
کل روا رکھی تھی تم نے میں روا رکھتا ہوں آج

مسلمانوں کے طویل سجدوں کو بیکاری کا باعث دیتے ہوئے "غلاموں کی نماز" کا ایک شعر ملاحظہ ہو ؎

طویل سجدے اگر ہیں تو کیا تعجب ہے
ورائے سجدہ غریبوں کو اور ہے کیا کام

سرمایہ داروں کی منافقانہ عبادت کی مذمت ؎

اے شیخ امیروں کو مسجد سے نکلوا دے
ہے ان کی عبادت سے محراب ترش ابرو

ہمت و عمل کے بغیر خانقاہوں سے مدد کی اُمید۔ لمبی لمبی دعاؤں اور مناجاتوں کے صلہ میں گھر بیٹھے وقار حاصل کرنے کی آرزو۔ تقدیر پر تکیہ۔ یہ تمام باتیں اقبال کے خیال میں لغو اور

حماقت پر مبنی ہیں ؎

کر سکتی ہے بے معرکہ جینے کی تلافی
اے پیرِ حرم تیری مناجاتِ سحر کیا
ممکن نہیں تخلیقِ خودی خانقہوں سے
اس شعلۂ نم خوردہ سے ٹوٹے گا شرر کیا

تقدیر پر تکیہ کرنا مسلمانوں کی پستی کا باعث ہے ؎

تو اپنی سرنوشت اب اپنے قلم سے لکھ
خالی رکھی ہے خامۂ حق نے تری جبیں
یہ نیلگوں فضا جسے کہتے ہیں آسماں
ہمت ہو پر کشا تو حقیقت میں کچھ نہیں
بالائے سر رہا تو ہے نام اس کا آسماں
زیرِ پر آ گیا تو یہی آسماں زمیں

اقبال کا عقیدہ ہے کہ انسان کی صحیح اور مکمل زندگی رزمگاہوں میں بنتی ہے۔ وہ صحراؤں کی آزاد فضاؤں میں زندگی بسر کرنے والوں کو ترجیح دیتا ہے۔ اس کا ایمان ہے کہ لامتناہی تکالیف و مصائب برداشت کر کے انسان انسان بن جاتا ہے۔

فطرت کے مقاصد کی کرتا ہے نگہبانی
یا بندۂ صحرائی یا مردِ کہستانی
اے شیخ بہت اچھی مکتب کی فضا لیکن
بنتی ہے بیاباں میں فاروقی و سلمانی

صدیوں میں کہیں پیدا ہوتا ہے حریف اس کا
تلوار ہے تیزی میں صہبائے مسلمانی

اقبال سیاست فرنگ کا تار پود یوں بکھیرتا ہے ؎

وہ فاقہ کش کہ موت سے ڈرتا نہیں ذرا
روح محمدؐ اس کے بدن سے نکال دو
فکر عرب کو دے کے فرنگی تخیلات
اسلام کو حجاز و یمن سے نکال دو
اقبال کے نفس سے ہے لالے کی آگ تیز
ایسے غزل سرا کو چمن سے نکال دو

مصلح قوم

جب کسی مردہ قوم میں زندگی کی صلاحیت پیدا ہونے لگتی ہے۔ تو اس کو اپنی بربادیوں کا احساس ہوتا ہے۔ اور اس قوم میں کوئی ایسا بیدار مغز پیدا ہو جاتا ہے۔ جس میں سیادت و قیادت کی اہلیت ہوتی ہے۔ اور وہ نہایت تدبر و سنجیدگی سے اپنی قوم کے ہر رنگ میں اصلاح کرتا ہے۔

شاعر اسلام اقبال مرحوم بھی ایسے ہی قائدین میں سے ایک قائد تھے۔ وہ قوم جو اپنی ناعاقبت اندیشی۔ تدبر ناشناسی۔ اور سیاسی کمزوریوں کی بدولت صفحۂ ہستی سے حرف غلط کی طرح

مٹی ہوئی تھی۔ اسی مصلح قوم کی رہنمائی کی بدولت آج ایک زندہ قوم بن چکی ہے۔ وہ اقبال ہی تھا۔ جس کے پیدا کئے ہوئے تاثرات کی بدولت قلبِ خوابیدہ کے بجیں پیکر میں از سرِ نو بیداری و عمل کا جذبہ کارفرما ہو گیا۔

شاعرِ اعظم اپنے کلام بلاغت نظام میں موجودہ ماحول کو ظلمت سے تعبیر کرتے ہوئے اس کے مہلک تاثرات سے محفوظ رہنے کی تلقین کرتا ہے۔ اور بزرگانِ سلف کے نقوشِ قدم پر گامزن ہونے کی تعلیم دیتا ہے۔

اٹھ کہ ظلمت ہوئی پیدا افقِ خاور سے
بزم میں شعلہ نوائی سے اُجالا کر دیں
پھونک ڈالا تھا کبھی دفترِ باطل جس نے
حدّتِ دم سے اسی شعلہ کو پیدا کر دیں

ایک اور مقام پر کہا ہے ؎

تمنا آبرو کی ہے اگر گلزارِ ہستی میں
تو کانٹوں میں اُلجھ کر زندگی کرنے کی خو کر لے

شاعرِ حقیقی زندگی اُس زندگی کو سمجھتا ہے۔ جو مصائب و آلام سے ہمکنار ہو۔ شاہدِ فطرت کی نقاب کشائی کرتے ہوئے پھول اور کانٹے کی نسبت کو موزوں الفاظ میں پیش کیا جاتا ہے۔ کہ جس طرح پھول نازک اور خوشنما ہونے کے باوجود کانٹوں میں محصور

اور وابستہ ہوتا ہے۔ لیکن کانٹے اس کی نزاکت اور خوشنمائی میں سدباب نہیں ہوتے۔ اسی طرح رنج و مصیبت انسان کی زندگی کے راستوں میں سدباب نہیں ہو سکتے۔ بلکہ حقیقتاً وہی زندگی زندگی کہی جا سکتی ہے۔ جس میں رنج و مصیبت کے برداشت کی عادت ہو۔ اسی لئے شاعر اپنی قوم کو مصائب و آلام میں ثابت قدم رہنے کی تعلیم دیتا ہے۔ تاکہ مصائب برداشت کرتے کرتے خود مصائب ارتقائی منازل کا پیش خیمہ بن جائیں

یہی مقصود فطرت ہے یہی رمز مسلمانی
اخوت کی جہانگیری محبت کی فراوانی

اب یہ مصلح اعظم فلسفۂ محبت کی عالمگیر برکات کو واضح کرتا ہے۔ بلکہ فلسفۂ اسلام کو جامۂ شریعت میں آراستہ کر کے ملت خوابیدہ کے جسم میں روح زندگی پھونکنا چاہتا ہے۔ چنانچہ اسی نظریہ کو ایک دوسری جگہ اور زیادہ وضاحت سے بیان کیا ہے ۔

جو تو سمجھے تو آزادی ہے پوشیدہ محبت میں
غلامی ہے اسیر امتیاز ما و تو رہنا

شاعر کی بالغ نظری داد کی مستحق ہے۔ کہ وہ محبت و اجتماعیت کے اعلیٰ مقاصد کو ملحوظ رکھ کر ریگستان بادۂ توحید کو تمنائے عمل کی طرف دعوت دیتے ہوئے محبت کی صداقت منعکس کرنا چاہتا

ہے۔ یہ حقیقت ہے۔ کہ محبت اخلاقیات کا رکنِ اعظم ہے۔ نظامِ عالم کا انحصار محبت ہی پر قائم ہے۔ اور یہی ایک ایسی چیز ہے۔ جو امتیازِ نسل و رنگ کا قلع قمع کر دیتی ہے۔ لہذا شاعر مقاصد عالیہ کی وضاحت کر کے اپنی قوم کو اس کے حاصل کرنے کا سبق دیتا ہے ؎

وائے نادانی کہ تو محتاجِ ساقی ہو گیا
مے بھی تُو۔ مینا بھی تُو۔ ساقی بھی تُو محفل بھی تُو

قوم کی دست نگری اور زبوں حالی دیکھ کر شاعر بیتاب ہو جاتا ہے۔ اور ان بیتابانہ جذبات کے تحت میں رنگین اور جرأت آموز تخیلات سے اپنی قوم کو مخاطب کر کے کہتا ہے۔ کہ اے مسلم! تیری ہی دنیا میں تہذیب۔ تمدن۔ معاشرت۔ اور علم و عمل کے دیوتاؤں نے جنم لیا۔ اور تو خود ہی دوسروں کی دست نگری میں زندگی بسر کر رہا ہے۔ خوابِ غفلت سے بیدار ہو۔ اور ان صفاتِ عالیہ کو جن کی اہلیت تیری تخلیق میں ودیعت ہے حاصل کر۔ تیری ذات وہ ذات ہے۔ جس کو تمام کائنات پر فضیلت حاصل ہے۔ اٹھ! اس راز کو سمجھ کر تمام دنیا پر شہنشاہی کر۔

تجھے اُس قوم نے پالا تھا آغوشِ محبت میں
کچل ڈالا تھا جس نے پاؤں سے تاجِ سرِ دارا

گنوا دی تُو نے جو اسلاف سے میراث پائی تھی
ثریا سے زمیں پر آسماں نے تجھ کو دے مارا

بزرگانِ سلف کے کارناموں کو یاد دلاتے ہوئے مسلمانوں سے کہا جاتا ہے۔ کہ تم نے اُس قوم کی آغوش میں پرورش پائی ہے۔ جو باوجود قلیل جماعت ہونے کے اپنی ہمت و استقلال کی بدولت دارا جیسے شہنشاہ اعظم پر فتح یاب ہوئی۔ مگر افسوس آج تم نے اپنے بزرگوں کی ان قابلِ قدر صفات کو ضایع کر دیا۔ جو تم کو وراثت میں ملی تھیں۔ اور ذلت کی زندگی گزار رہے ہو۔ ایک اور مقام پر یہ مصلح اعظم کہتا ہے۔

سبق پھر پڑھ صداقت کا عدالت کا شجاعت کا
لیا جائے گا تجھ سے کام دُنیا کی امامت کا

شاعرِ مسلمانوں کو مکمل مسلمان کی حیثیت میں دیکھنے کا متمنی ہے۔ اس کی نگاہیں دیکھ رہی ہیں۔ کہ موجودہ دور کے مسلمان اقوامِ عالم سے بہت پیچھے ہیں۔ اس لئے وہ ان نیند کے متوالوں کو جھنجھوڑ جھنجھوڑ کر جگاتا ہے۔ کہ اے مسلم خوابیدہ کبتک تو اس زبوں حالی میں بسر کرے گا۔ اُٹھ اور اس ذلت کی دنیا سے نکل۔ جہانِ رنگ و بو کی قیادت و سیادت کے زرین تاج سے اپنے سر کو مزین کر۔ مسلمانی صرف کلمہ پڑھنے اور مسجد کے حجروں میں بیٹھ رہنے کا نام نہیں۔

بلکہ توحید اور نبوت کے قائل ہونے کے ساتھ ہی ساتھ صداقت۔ عدالت۔ شجاعت۔ حلم اور بردباری بھی حاصل کرے

حادثاتِ غم سے ہے انساں کی فطرت کو کمال
غازہ ہے آئینۂ دل کے لئے گردِ ملال
غم جوانی کو جگا دیتا ہے لطفِ خواب سے
ساز یہ بیدار ہوتا ہے اسی مضراب سے
طائرِ دل کے لئے غم شہپرِ پرواز ہے
راز ہے انساں کا دل۔ غم انکشافِ راز ہے
غم نہیں ہے روح کا اک نغمۂ خاموش ہے
جو سرودِ بربطِ ہستی سے ہم آغوش ہے

ان اشعار میں بھی غم و آلام کی برکات کا تذکرہ کرکے بتایا گیا ہے۔ کہ وہی مکمل انسان ہے۔ اور وہی زندہ قوم ہے۔ جو اپنے اسلاف کی روایات کو فراموش نہ کرے۔ بلکہ انہی کے نقشِ قدم پر چل کر دنیا میں جہانگیری حاصل کرے۔ چنانچہ اسلام کی ابتدا کتنے مختصر افراد سے ہوتی ہے۔ اور وہ کیونکر دنیا پر غلبہ حاصل کر لیتے ہیں۔ یہ کیا تھا۔ صرف اُن کے استقلال کا نتیجہ تھا۔ وہ غم و آلام کو کھیل سمجھتے تھے۔ وہ مصائب کے پہاڑ کو ہنسی خوشی کاٹ کر پھینک دیا کرتے تھے۔ نتیجہ یہ ہوا۔ کہ تمام دنیا پر ان کو غلبہ حاصل ہوگیا۔ اگر موجودہ

دور کے مسلمان بھی اپنی کے نقش قدم پر چلنے کی کوشش
کریں۔ تو پھر عظمت رفتہ واپس ہو سکتی ہے۔

اقبال کا ایک خط

محترمی نکلسن۔

شفیع کے نام آپ نے جو مکتوب تحریر فرمایا ہے۔ اس سے مجھے یہ معلوم کر کے بیحد مسرت ہوئی۔ کہ اسرار خودی کا ترجمہ انگلستان میں قبول عام حاصل کر رہا ہے۔ بعض انگریز تنقید نگاروں نے اس سطحی تشابہ اور تماثل سے جو میرے اور نیٹشے کے خیالات میں پایا جاتا ہے۔ دھوکا کھایا ہے۔ اور غلط راہ پر پڑ گئے ہیں۔ "دی ہینتھم" والے مضمون میں جو خیالات ظاہر کئے گئے ہیں۔ وہ بہت حد تک حقائق کی غلط فہمی پر مبنی ہیں۔ لیکن اس غلطی کی ذمہ داری صاحب مضمون پر عائد نہیں ہوتی۔ اس نے اپنے مضمون میں میری جن نظموں کا ذکر کیا ہے۔ اگر اسے اُن کی صحیح تاریخ اشاعت کا بھی علم ہوتا۔ تو مجھے یقین ہے۔ کہ میری ادبی سرگرمیوں کے ارتقار کے متعلق اس کا زاویۂ نگاہ بالکل مختلف نظر آتا۔

وہ انسان کامل کے متعلق میرے تخیل کو صحیح طور پر نہیں سمجھ سکا۔ یہی وجہ ہے۔ کہ اس نے خلط بحث کر کے میرے

انسان کامل اور جرمن مفکر کے فوق الانسان کو ایک ہی چیز فرض کر لیا ہے۔ میں نے آج سے تقریباً بیس سال قبل انسان کامل کے متصوفانہ عقیدے پر قلم اُٹھایا تھا۔ اور یہ وہ زمانہ ہے۔ جب نہ تو نیٹشے کے عقائد کا غلغلہ میرے کانوں تک پہنچا تھا۔ نہ اُس کی کتابیں میری نظر سے گزری تھیں۔ یہ مضمون "انڈین انٹی کیوری" میں شائع ہوا۔ اور جب ۱۹۰۸ء میں میں نے "ایرانی الٰہیات" پر ایک کتاب لکھی۔ تو اس مضمون کو اس میں شامل کر لیا گیا۔

انگریزوں کو چاہیئے۔ کہ میرے خیالات کو سمجھنے کے لئے جرمن مفکر کے بجائے اپنے ایک ہم وطن فلسفی کے افکار کو رہنما بنائیں۔ میری مراد الگزنڈر سے ہے۔ جس کے گلاسگو والے خطبات پچھلے سال شائع ہو چکے ہیں۔ ان خطبات میں اس نے "خدا اور الوہیت" کے عنوان سے جو باب لکھا ہے۔ وہ پڑھنے کے قابل ہے۔ وہ صفحہ ۳۴۷ پر لکھتا ہے۔

"گویا ذہن انسانی کے نزدیک دوسری اعلیٰ تجریدی قوت ہے۔ جسے کائنات عالم وجود میں لانے کی سعی کر رہی ہے۔ قیاس و اجتہاد کی رہنمونی سے ہمیں یقین ہو چکا ہے۔ کہ بطن گیتی میں اس قسم کی ایک قوت موجود ہے۔ لیکن ہم نہیں جانتے۔ کہ وہ قوت کیا ہے۔ ہم نہ تو اُسے محسوس کر سکتے ہیں۔ نہ ہمارا

ذہن اُس کے تصوّر پر قادر ہے۔ انسان ابھی تک ایک نامعلوم خدا کے لئے قربانگاہیں تعمیر کر رہا ہے۔ یہ معلوم کرنا کہ الوہیت کیا چیز ہے۔ اس کا احساس کیسا ہوتا ہے۔ اس صورت میں ممکن ہے۔ کہ ہم خدا بن جائیں"

الگزنڈر کے خیالات میرے عقائد کی نسبت زیادہ جسارت آمیز ہیں۔ میرا عقیدہ ہے۔ کہ کائنات میں جذبۂ الوہیت جاری و ساری ہے۔ لیکن میں الگزنڈر کی طرح یہ نہیں مانتا۔ کہ یہ قوت ایک ایسے خدا کے وجود میں جلوہ آرا ہوگی۔ جو وقت کا تابع ہوگا۔ اس باب میں میرا عقیدہ یہ ہے۔ کہ یہ قوت ایک اکمل و اعلیٰ انسان کے پیکر خاکی میں ظاہر ہوگی۔ خدا کے متعلق الگزنڈر کا عقیدہ میرے عقیدے سے مختلف ہے۔ لیکن اگر انگریز ان جزوی اختلافات سے قطع نظر کر کے انسان کامل کے تخیل پر اپنے ایک ہم وطن مفکر کے افکار کی روشنی میں نظر ڈالیں۔ تو انہیں یہ عقیدہ اس قدر اجنبی اور غیر مانوس نہیں معلوم ہوگا۔

مجھے مسٹر ڈکنسن کی تقریر بدرجۂ غائیت دلچسپ معلوم ہوتی ہے اور مناسب معلوم ہوتا ہے۔ کہ مَیں اس کے متعلق چند باتیں عرض کروں۔

(۱) مسٹر ڈکنسن کے نزدیک مَیں نے اپنی نظموں میں جسمانی

قوت کو منتہائے آمال قرار دیا ہے۔ (انہوں نے مجھے ایک مکتوب لکھا ہے۔ جس میں یہی خیال ظاہر کیا ہے) انہیں اس بارے میں غلط فہمی ہوئی ہے۔ میں روحانی قوت کا تو قائل ہوں۔ لیکن جسمانی قوت پر یقین نہیں رکھتا۔ جب ایک قوم کو حق و صداقت کی حمایت میں دعوتِ پیکار دی جائے۔ تو اس دعوت پر لبیک کہنا اس کا فرض ہے۔ لیکن میں ان تمام جنگوں کو مردود سمجھتا ہوں۔ جن کا مقصد محض کشور کشائی اور ملک گیری ہو۔

مسٹر ڈکنسن نے صحیح فرمایا ہے۔ کہ جنگ خواہ حق و صداقت کی حمایت میں ہو۔ خواہ ملک گیری اور فتح مندی کی خاطر۔ تباہی اور بربادی اس کا لازمی نتیجہ ہے۔ اس لئے اس کے استیصال کی سعی کرنا چاہیئے۔ لیکن ہم دیکھ چکے ہیں۔ کہ معاہدے لیگیں پنچائتیں۔ اور کانفرنسیں استیصال حرب نہیں کر سکتیں۔ اگر ان مساعی میں ہمیشہ بیش از بیش کامیابی حاصل ہوجائے۔ تو زیادہ سے زیادہ یہ ہوگا۔ کہ ملل مستعمرہ جن ملتوں کو تمدن و تہذیب میں اپنا ہمسر نہیں سمجھتیں۔ انہیں اپنے سہام جور و تعدی کا شکار بنانے کے لئے زیادہ پُر امن وسائل اختیار کر لیں گی۔ حقیقت یہ ہے۔ کہ ہمیں ایک شخصیت کی ضرورت ہے۔ جو ہمارے معاشری مسائل کی گتھیاں سلجھائے۔ ہمارے تنازعات کا فیصلہ کرے۔ اور بین الملی اخلاق کی بنیاد مستحکم و استوار کردے

پروفیسر مکنزی کی کتاب "انٹروڈکشن ٹو سوشیالوجی" کے یہ دو آخری پیراگراف کس قدر صحیح ہیں۔ میں اُنہیں یہاں لفظ بلفظ نقل کر دیتا ہوں۔

"کامل انسان کے بغیر سوسائٹی معراج کمال پر نہیں پہنچ سکتی۔ اور اس غرض کے لئے محض عرفان اور حقیقت آگاہی کافی نہیں۔ بلکہ ہیجان اور تحریک کی قوت ضروری ہے۔ جیسے یوں کہنا چاہیئے۔ کہ یہ معمہ حل کرنے کے لئے ہم نور و حرارت دونوں کے محتاج ہیں۔ غالباً عہدِ حاضرہ کے معاشری مسائل کا فلسفیانہ فہم و ادراک بھی وقت کی اہم ترین ضرورت نہیں۔ ہمیں معلم بھی چاہیئے۔ اور پیغمبر بھی۔ ہمیں آج رسکن۔ یا کارلائل یا ٹالسٹائی جیسے لوگوں کی ضرورت ہے۔ جو ضمیر کو زیادہ متشدد اور سخت گیر بنانے اور فرائض کے دائرے کو زیادہ وسیع کرنے کی صلاحیت رکھتے ہوں۔ غالباً ہمیں ایک مسیح کی ضرورت ہے۔۔۔۔

یہ قول صحیح ہے۔ کہ عہدِ حاضرہ کے پیغمبر کو محض بیابان کی صدا نہیں ہونا چاہیئے۔ کیونکہ عہدِ حاضرہ کے "بیابان" آباد شہروں کی گلی کوچے ہیں۔ جہاں ترقی کی مسلسل و پیہم جدوجہد کا بازار گرم ہے۔ اس عہد کے

پیغمبر کے لئے ضروری ہے۔ کہ وہ اسی ہنگامۂ زار میں وعظ و تبلیغ کرے۔ غالباً ہمیں پیغمبر سے بھی زیادہ عہد نو کے شاعر کی ضرورت ہے۔ یا ایک ایسے شخص کا وجود ہمارے لئے مفید ثابت ہوگا۔ جو شاعری اور پیغمبری کی دوگونہ صفات سے متصف ہو۔ عہد ماضی کے شاعروں نے ہمیں فطرت سے محبت کرنے کی تعلیم دی ہے۔ انہوں نے ہمیں اس قدر شرف نگاہ بنا دیا ہے۔ کہ ہم مظاہر فطرت میں انوار ربانی کا مشاہدہ کر سکتے ہیں۔ لیکن ہم ابھی ایک ایسے شاعر کے منتظر ہیں۔ جو ہمیں اسی وضاحت کے ساتھ پیکر انسانی میں صفاتِ الٰہی کے جلوے دکھا دے۔ ہائنے نے ازراہِ تفنن اپنے آپ کو "روح القدس کا سپاہی" کہا تھا۔ ہمیں ایسے شخص کی ضرورت ہے۔ جو درحقیقت روح القدس کا سپاہی ہو۔ جو اس حقیقت پر ہماری آنکھیں کھول دے۔ کہ ہمارے بلند ترین نصب العین روزمرہ کی زندگی میں پورے ہو رہے ہیں۔ اور اگر اس زندگی کو ترقی دینے کی سعی کی جائے۔ تو ہمیں محض راہبانہ ریاضت اور نفس کشی ہی کا موقع نہیں ملے گا۔ بلکہ ایسا ارفع و اعلیٰ مقصد حاصل ہو جائے گا۔ جو

تمام خیالات۔ تمام جذبات اور تمام مسرتوں کو
ترقی کے بلند مقام پر پہنچا سکتا ہے،،
انگریزوں کو چاہیئے۔ کہ اس نوع کے خیالات کی روشنی میں انسان کامل کے متعلق میرے افکار کا مطالعہ کریں۔ ہمارے عہد نامے اور پنچائتیں جنگ و پیکار کو صفحۂ حیات سے محو نہیں کر سکتیں۔ کوئی بلند مرتبہ شخصیت ہی ان مصائب کا خاتمہ کر سکتی ہے۔ اور اس شعر میں میں نے اسی کو مخاطب کیا ہے سہ

باز دد عالم بیار ایام صلح
جنگ جویاں رابدہ پیغام صلح

(۲) مسٹر ڈکنسن نے آگے چل کر میرے "فلسفۂ سخت کوشی" کا ذکر کیا ہے۔ انہوں نے اس باب میں جو کچھ فرمایا ہے۔ اس کا مدار علیہ وہ خیالات ہیں۔ جو میں نے حقیقت کے متعلق اپنی نظموں میں ظاہر کئے ہیں۔ میرے عقیدہ میں حقیقت ایسے اجزا کا مجموعہ ہے۔ جو تصادم کے واسطہ سے رابط وامتزاج پیدا کر کے "کل" کی صورت میں تبدیلی کی سعی کر رہے ہیں۔ اور یہ تصادم لامحالہ ان کی شیرازہ بندی اور انبساط پر منتج ہوگا۔
دراصل بقائے شخص اور زندگی کے علو وارتقا کے لئے تصادم نہایت ضروری ہے۔ نیٹشے بقائے شخص کا منکر ہے۔ جو شخص حصول بقا کے آرزومند ہیں۔ وہ ان سے کہتا ہے "کیا تم ہمیشہ

کے لئے زمانے کی پشت کا بوجھ بنے رہنا چاہتے ہو۔" اس کے قلم سے یہ الفاظ اس لئے نکلے ہیں۔ کہ زمانے کے متعلق اس کا تصور غلط تھا۔ اس نے کبھی مسئلۂ زمان کے اخلاقی پہلو کو سمجھنے کی کوشش نہیں کی۔ بخلاف اس کے میرے نزدیک بقا انسان کی بلند ترین آرزو اور ایسی متاع گرانمایہ ہے۔ جس کے حصول پر انسان اپنی تمام قوتیں مرکوز کر دیتا ہے۔ یہی وجہ ہے۔ کہ میں عمل کی تمام صور و اشکال مختلفہ کو جن میں تصادم و پیکار بھی شامل ہے۔ ضروری سمجھتا ہوں۔ اور میرے نزدیک ان سے انسان کو زیادہ استحکام و استقلال حاصل ہوتا ہے۔ چنانچہ اسی خیال کے پیش نظر میں نے سکون و جمود اور اس نوع کے تصوف کو جس کا دائرہ محض قیاس آرائیوں تک محدود ہو۔ مردود قرار دیا ہے۔

میں تصادم کو سیاسی حیثیت سے نہیں۔ بلکہ اخلاقی حیثیت سے ضروری سمجھتا ہوں۔ حالانکہ اس باب میں نیٹشے کے خیالات کا مدار غالباً سیاست ہے۔ جدید طبیعات سے معلوم ہوا ہے۔ کہ مادی قوت کے جزو لاتجزیٰ نے ہزارہا سال تک ارتقائی منازل طے کرنے کے بعد موجودہ صورت اختیار کی ہے۔ پھر بھی وہ فانی ہے۔ اور اسے مٹا دیا جا سکتا ہے۔ قوت ذہنی یا یوں کہہ لیجئے۔ کہ جسم انسانی کے خلیہ یا پروٹوپلازم کی بھی یہی کیفیت ہے۔

صدہا برس کی مسلسل جدوجہد اور تصادم و پیکار کے بعد وہ موجودہ صورت تک پہنچا ہے۔ پھر بھی عوارضِ ذہنی کے مظاہر مختلفہ سے اس کی بے ثباتی اور عدم استحکام ظاہر ہے۔ اگر وہ بدستور قائم و باقی رہنا چاہتا ہے۔ تو یقیناً وہ ماضی کے درس عبرت کو فراموش نہیں کر سکتا۔ اُسے لامحالہ ان قوتوں سے اپنے قیام کی خاطر استمداد کرنی پڑے گی۔ جو آج تک اس کے استحکام کی ضامن رہی ہیں۔ ممکن ہے۔ کہ فطرت کا ارتقا ان قوتوں میں اصلاح کر دے۔ یا ان میں سے بعض کو (مثلاً تصادم اور جنگ و پیکار کو جو استحکام کے قوی عوامل میں سے ہیں۔) جو اس کی ارتقا کی کفیل بنی رہی ہیں۔ بالکل مٹا دے۔ اور اس کے استحکام و بقا کی خاطر بعض ایسی قوتیں عرصۂ شہود میں لے آئے۔ جن سے انسان آج تک ناآشنا رہا ہے۔ لیکن میں تبا دینا چاہتا ہوں۔ کہ میں اس باب میں کسی نصب العین کا پرستار نہیں ہوں۔ اس لئے میرے نزدیک اس نوع کے انقلاب کا زمانہ ابھی دور ہے۔ اور مجھے اندیشہ ہے۔ کہ یورپ کی جنگِ عظیم میں انسان کی بصیرت و موعظت کا جو سرمایہ پنہاں ہے۔ وہ اس سے عرصۂ دراز تک متمتع نہ ہو سکے گا۔

ان سطور سے واضح ہو گیا ہے۔ کہ میں نے محض اخلاقی زاویۂ نگاہ سے تصادم و پیکار کو ضروری قرار دیا ہے۔ افسوس ہے۔ کہ

مسٹر ڈکنسن نے "فلسفۂ سخت کوشی" کے اِس پہلو کو نظر انداز کر دیا ہے۔

(۳) مسٹر ڈکنسن نے آگے چل کر میرے فلسفے کے متعلق فرمایا ہے۔ کہ وہ اپنی حیثیت کے اعتبار سے عالمگیر ہے۔ لیکن باعتبار اطلاق و انطباق مخصوص و محدود ہے۔ ایک حیثیت سے ان کا ارشاد صحیح ہے۔ انسانیت کا نصب العین شعر اور فلسفہ میں عالمگیر حیثیت سے پیش کیا گیا ہے۔ لیکن اگر اسے موثر نصب العین بنانا اور عملی زندگی میں بروئے کار لانا چاہیں۔ تو آپ شاعروں اور فلسفیوں کو اپنا مخاطب اولیں نہیں ٹھیرائیں گے۔ اور ایک ایسی مخصوص سوسائٹی تک اپنا دائرہ محدود کر دیں گے۔ جو ایک مستقل عقیدہ اور معین راہِ عمل رکھتی ہو۔ لیکن اپنے عملی نمونے اور ترغیب و تبلیغ سے ہمیشہ اپنا دائرہ وسیع کرتی چلی جائے۔ میرے نزدیک اس قسم کی سوسائٹی اسلام ہے۔

اسلام ہمیشہ رنگ و نسل کے عقیدے کا جو انسانیت کے نصب العین کی راہ میں سب سے بڑا سنگِ گراں ہے۔ نہایت کامیاب حریف رہا ہے۔ رنیان کا یہ خیال ہے۔ کہ سائنس اسلام کا سب سے بڑا دشمن ہے۔ دراصل اسلام بلکہ کائناتِ انسانیت کا سب سے بڑا دشمن رنگ و نسل کا عقیدہ ہے۔ جو لوگ نوعِ انسان سے محبت رکھتے ہیں۔ ان کا فرض ہے۔

کہ ابلیس کی اس اختراع کے خلاف علم جہاد بلند کردیں۔ میں دیکھ رہا ہوں۔ کہ قومیت کا عقیدہ جس کی بنیاد نسل یا جغرافیائی حدودِ ملک پر ہے۔ دنیائے اسلام میں استیلا حاصل کر رہا ہے۔ اور مسلمان عالمگیر اخوت کے نصب العین کو نظر انداز کر کے اس عقیدہ کے فریب میں مبتلا ہو رہے ہیں۔ جو قومیت کو ملک و وطن کی حدود میں مقید رکھنے کی تعلیم دیتا ہے۔ اس لئے میں ایک مسلمان اور ہمدرد نوع کی حیثیت سے انہیں یہ یاد دلانا مناسب سمجھتا ہوں۔ کہ ان کا حقیقی فرض سارے بنی آدم کی نشو و ارتقا ہے نسل اور حدودِ ملک کی بنیاد پر قبائل اور اقوام کی تنظیم۔ حیاتِ اجتماعی کی ترقی اور تربیت کا ایک وقتی اور عارضی پہلو ہے۔ اگر اسے یہی حیثیت دی جائے۔ تو مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ لیکن میں اس چیز کا مخالف ہوں۔ کہ اسے انسانی قوتِ عمل کا مظہر اتم سمجھا جائے۔

یہ درست ہے۔ کہ مجھے اسلام سے بیحد محبت ہے۔ لیکن مسٹر ڈکنسن کا یہ خیال صحیح نہیں۔ کہ میں نے محض اس محبت کے پیشِ نظر مسلمانوں کو اپنا مخاطب ٹھیرایا ہے۔ بلکہ دراصل عملی حیثیت سے میرے لئے اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ کہ ایک خاص جماعت یعنے مسلمانوں کو اپنا مخاطب قرار دیا جائے کیونکہ تنہا یہی جماعت میرے مقاصد کے لئے موزوں واقع ہوئی ہے۔ مسٹر ڈکنسن کا یہ خیال بھی تسامح سے خالی نہیں۔ کہ

اسلامی تعلیمات کی روح کسی خاص گروہ سے مختص ہے۔ اسلام تو کائنات انسانیت کے اتحاد عمومی کو پیش نظر رکھتے ہوئے ان کے تمام جزوی اختلافات سے قطع نظر کر لیتا ہے۔ اور کہتا ہے۔

تَعَالَوْا إِلَىٰ كَلِمَةٍ سَوَاءٍ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ

میرے خیال میں مسٹر ڈکنسن کا ذہن ابھی تک یورپ والوں کے اس قدیم عقیدے سے آزاد نہیں ہوا۔ کہ اسلام سفاکی اور خونریزی کا درس دیتا ہے۔ در اصل خدا کی ارضی بادشاہت صرف مسلمانوں کے لئے مخصوص نہیں۔ بلکہ تمام انسان اس میں داخل ہو سکتے ہیں۔ بشرطیکہ وہ نسل اور قومیت کے بتوں کی پرستش ترک کر دیں۔ اور ایک دوسرے کی شخصیت تسلیم کر لیں۔ انجمنیں حکمبرداریاں۔ اس قسم کے عہد نامے جن کا ذکر مسٹر کینز نے کیا ہے۔ ملکیت خواہ وہ جمہوریت ہی کی قبا میں پوشیدہ کیوں نہ ہو۔ انسان کو فوز و فلاح سے آشنا نہیں کر سکتی۔ بلکہ انسانی فلاح تمام انسانوں کی مساوات اور حریت میں پنہاں ہے۔ آج ہمیں اس چیز کی ضرورت ہے۔ کہ سائنس کا محل استعمال قطعی طور پر بدل دیا جائے۔ ان خفیہ سیاسی منصوبوں سے احتراز کیا جائے جن کا مقصد بھی یہ ہے۔ کہ کمزور اور زبوں حال یا ایسی قوم جو عیاری اور حیلہ گری کے فن میں چنداں مہارت نہیں رکھتی۔ صفحۂ ہستی سے

نیست و نابود ہو جائے۔ مجھے اس حقیقت سے انکار نہیں۔ کہ مسلمان بھی دوسری قوموں کی طرح جنگ کرتے رہے ہیں۔ انہوں نے بھی فتوحات کی ہیں۔ مجھے اس امر کا بھی اعتراف ہے۔ کہ ان کے بعض قافلہ سالار ذاتی خواہشات کو دین و مذہب کے لباس میں جلوہ گر کرتے رہے ہیں۔ لیکن مجھے پوری طرح یقین ہے۔ کہ کشور کشائی اور ملک گیری اسلام کے مقاصد میں نہ تھی۔ اسلام کو جہاں ستانی اور کشور کشائی میں جو کامیابی ہوئی ہے۔ میرے نزدیک وہ اس کے مقاصد کے حق میں بیحد مضر تھی۔ اس طرح وہ اقتصادی اور جمہوری اصول نشوونما نہ پا سکے۔ جن کا ذکر قرآن کریم اور احادیثِ نبوی میں جا بجا آیا ہے۔ یہ صحیح ہے۔ کہ مسلمانوں نے ایک عظیم الشان سلطنت قائم کر لی لیکن ساتھ ہی ان کے سیاسی نصب العین پر غیر اسلامی رنگ چڑھ گیا۔ اور انہوں نے اس حقیقت کی طرف سے آنکھیں بند کر لیں۔ کہ اسلامی اصولوں کا گیرائی دائرہ کس قدر وسیع ہے۔

اسلام کا یقیناً مقصد یہ ہے۔ کہ دوسری قوموں کی جداگانہ حیثیت مٹا ڈالے۔ اور انہیں اپنے اندر جذب کر لے۔ بلکہ صرف اسلام کی سیدھی سادی تعلیم جو الٰہیات کے دقیق اور پیچیدہ مسائل سے پاک اور عقلِ انسانی کے عین مطابق واقع ہوئی ہے۔ اس عقدہ کی گرہ کشائی کر سکتی ہے۔ اسلام کی فطرت میں ایسے اوصاف

پنہاں ہیں۔ جن کی بدولت وہ کامیابی کے بام بلند پر پہنچ سکتا ہے۔ ذرا چین کے حالات پر نظر ڈالئے۔ جہاں کسی سیاسی قوت کی پشت پناہی کے بغیر اسلام کے تبلیغی مشن نے غیر معمولی کامیابی حاصل کرلی۔ اور لاکھوں انسان خیل در خیل اسلام کے دائرہ میں داخل ہوگئے۔ میں بیس سال سے دنیا کے افکار کا مطالعہ کر رہا ہوں۔ اور اس طویل عرصہ نے مجھ میں اس قدر صلاحیت پیدا کر دی ہے۔ کہ حالات و واقعات پر غیر جانبدارانہ حیثیت سے غور کر سکوں۔

میری فارسی نظموں کا مقصود اسلام کی وکالت نہیں۔ بلکہ میری قوت طلب و جستجو تو صرف اس چیز پر مرکوز رہی ہے۔ کہ ایک جدید معاشری نظام تلاش کیا جائے۔ اور عقلاً یہ ناممکن معلوم ہوتا ہے۔ کہ اس کوشش میں ایک ایسے معاشری نظام سے قطع نظر کرلیا جائے۔ جس کا مقصد وحید ذات پات۔ رتبہ و درجہ۔ رنگ و نسل کے تمام امتیازات کو مٹا دیتا ہے۔ اسلام دنیوی معاملات کے باب میں نہایت ژرف نگاہ بھی ہے۔ اور پھر انسان میں بے نفسی اور دنیوی لذائذ و نعم کے ایثار کا جذبہ بھی پیدا کرتا ہے۔ اور حسن معاملت کا تقاضہ یہی ہے۔ کہ اپنے ہمسایوں کے بارے میں اسی قسم کا طریقہ اختیار کیا جائے۔ یورپ اس گنج گراں مایہ سے محروم ہے۔ اور یہ متاع اسے

ہمارے ہی فیضِ محبت سے حاصل ہو سکتی ہے۔

میں اس بارے میں ایک بات اور کہنا چاہتا ہوں۔ میں نے اسرار خودی پر چند تشریحی نوٹ لکھے تھے۔ جنہیں آپ نے دیباچہ اسرار خودی میں شامل کر لیا ہے۔ ان تفسیری حواشی میں میں نے مغربی مفکرین کے افکار و عقائد کی روشنی میں اپنی حیثیت واضح کی ہے۔ یہ طریق محض اس لئے اختیار کیا گیا تھا۔ تاکہ انگلستان کے لوگ میرے خیالات بآسانی سمجھ سکیں۔ ورنہ قرآن حکیم صوفیائے کرام اور مسلمان فلسفیوں کے افکار سے بھی استدلال کیا جا سکتا ہے۔ چنانچہ میں نے اسرار کے پہلے ایڈیشن میں بزبانِ اردو جو دیباچہ لکھا ہے۔ اس میں یہی طریق استدلال اختیار کیا گیا ہے۔

میرا دعوے ہے۔ کہ "اسرار" کا فلسفہ صوفیا اور علما کے افکار و مشاہدات سے ماخوذ ہے۔ اور تو اور وقت کے متعلق برگسان کا عقیدہ بھی ہمارے صوفیوں کے لئے نئی چیز نہیں۔ قرآن الٰہیات کی کتاب نہیں۔ بلکہ اس میں انسان کی معاش و معاد کے متعلق جو کچھ کہا گیا ہے۔ پوری قطعیت سے کہا گیا ہے۔ اور بات یہ ہے۔ کہ ان کا تعلق الٰہیات کے ہی مسائل سے ہے۔ عہد جدید کا ایک مسلمان اہل علم جب ان مسائل کو مذہبی تجربات اور افکار کی روشنی میں بیان کرتا ہے۔ جن کا مبدا اور سرچشمہ قرآن مجید ہے

تو اس سے یہ نہیں سمجھنا چاہیئے۔ کہ جدید افکار کو قدیم لباس میں پیش کیا جا رہا ہے۔ بلکہ یوں کہنا چاہیئے۔ کہ پُرانے حقائق کو جدید افکار کی روشنی میں بیان کیا گیا ہے۔ بدقسمتی سے اہل مغرب اسلامی فلسفے کی تعلیم سے ناآشنائے محض ہیں۔ اے کاش مجھے اس قدر فرصت ہوتی۔ کہ میں اس موضوع پر ایک مبسوط کتاب لکھ کر مغربی فلسفیوں کو اس حقیقت سے روشناس کر دیتا۔ کہ دنیا کی مختلف قوموں کے فلسفیانہ خیالات ایک دوسرے سے کس قدر مشابہ ہیں۔

مترجمہ

چراغ حسن حسرت

شمس العلماء میر حسن مرحوم

اقبال کا کوئی تذکرہ اس وقت تک مکمل نہیں کہا جا سکتا۔ جبتک کہ اس کے محسن استاد کے حالات سے وہ مزین نہ ہو جس کے فیوض کی بدولت اقبال ذوقِ تپش سے آشنا ہوا۔

یہ حقیقت ہے۔ کہ شاعر کی سرشت میں وہ عناصر آفرینش عالم کے وقت ودیعت کر دیئے جاتے ہیں۔ جو گہرہائے معانی کی کان ہوتے ہیں۔ ایک انگریز شاعر کا مقولہ ہے۔ کہ شاعر بطنِ مادر ہی سے شاعرانہ خلعت میں ملبوس ہو کر پیدا ہوتا ہے۔ اور عربی کا ایک مقولہ ہے۔ کہ شاعر کو مبداء فیاض کے سوا کسی سے تلمذ نہیں ہوتا۔ ان تمام حقایق کے باوجود بھی ازکار نہیں کیا جا سکتا۔ کہ شاعر کے خیالات پر گرد و پیش کے حالات۔ مطالعہ۔ استاد کے رجحانات اور خیالات کا اثر نہیں ہوتا۔ ہوتا ہے۔ اور ضرور ہوتا ہے۔

شکسپیئر اگر تھیٹر میں سائیس کی حیثیت سے ملازمت نہ کرتا۔ تو آج دنیا اسے ڈرامہ کا مہر منیر تسلیم نہ کرتی۔

فردوسی نے محمود کے دربار میں باریابی حاصل کرنے سے پہلے ہی شاہنامے کا آغاز کر دیا تھا۔ لیکن اگر محمود کی علم پروری اس کو اپنے سایہ میں نہ لیتی۔ تو کبھی اس شان سے شاہنامہ مکمل نہ

ہو سکتا۔ غالب اگر عبدالصمد ایرانی کی عنایات اور برکات سے انکار کرتے ہوئے اپنی ظرافت طبع کا ثبوت دیتا ہے۔ تو دیا کرے۔ حقیقتاً یہ علمی مذاق عبدالصمد ایرانی کا پیدا کیا ہوا تھا۔ جس کی بدولت غالب غالب ہوا۔ یہ اور بات ہے۔ کہ فارسی کے بجائے وہ اردو کا شاعر ہوا۔ اقبال کو قدرت نے دل و دماغ کی تمام قوتیں فراوانی کے ساتھ عطا فرمائیں۔ لیکن مولوی میر حسن کی نگرانی نے ان پر سہاگہ کا کام کیا۔

میر حسن مرحوم سیالکوٹ کے ایک سادات خاندان میں پیدا ہوئے۔ سات سال کی عمر میں یہ میر حسن سے حافظ میر حسن ہوئے۔ اور علوم مروجہ کی تحصیل کے لئے مولانا محبوب عالم سیالکوٹی کے حلقۂ درس میں شامل ہوئے۔ اس کے بعد مولوی بشیر احمد سے عربی پڑھی۔ سولہ سال کی عمر میں خود تعلیم و تربیت کا سلسلہ شروع کر دیا۔ ملازمت کی تلاش تھی۔ مشن سکول میں اُستاد مقرر ہو گئے۔ اور تمام عمر اسی ملازمت میں گزار دی۔ ابتداء میں پرائمری جماعتوں کو فارسی۔ عربی۔ حساب اور جغرافیہ پڑھاتے رہے۔ اور جب پرائمری کی تعلیم ختم ہوئی۔ تو ہائی جماعتوں کے لئے ان کا تقرر ہوا۔ مشن سکول جب کالج بن گیا۔ تو مولوی صاحب اس میں السنہ شرقیہ کے پروفیسر مقرر ہوئے۔ اور ترسٹھ سال کی ملازمت کے بعد بینائی زائل ہو گئی۔ اس بنا پر ۱۹۲۹ء میں اس مشغلہ سے دست کش ہوئے۔

اور ۲۵ ستمبر ۱۹۲۹ء کو عالم فانی سے عالم آخرت کی طرف انتقال فرما گئے۔

مولوی صاحب کے والدین مدت ہوئی انتقال کر چکے تھے۔ لیکن اُن کی وفات کے بعد مولوی صاحب کا ہمیشہ یہی دستور رہا۔ کہ ہر روز اُن کی قبروں پر جانا۔ اور فاتحہ پڑھکر واپس آنا۔ انتہائی بارش یا آندھی کوئی چیز مولوی صاحب کو اس کام سے روک نہ سکتی تھی۔ یہاں تک۔ کہ جب ان کی کمر ضعیفی کی وجہ سے دہری ہو چکی تھی۔ اور چلنا پھرنا دشوار تھا۔ اس حالت میں بھی بدستور اس فرض کی ادائیگی ہوتی رہی۔

فاضل صاحب منشی سراج دین صاحب کا بیان ہے۔ کہ ایک مرتبہ نجوم القرآن مطبوعہ جرمنی جو کہ ایک المانوی فاضل کی تصنیف تھی۔ منشی صاحب موصوف کو کہیں سے مستعار مل گئی۔ منشی صاحب نے وہ کتاب میر حسن مرحوم کی خدمت میں بغرض ملاحظہ پیش کی۔ مولوی صاحب نے کتاب دیکھ کر فرمایا۔ "ایک سو جید علما اگر پورے سو سال تک مجموعی کوشش کریں۔ تو ایسی کتاب مرتب ہو سکتی ہے۔ تعجب ہے۔ کہ ایک المانوی فاضل نے اپنی واحد کوشش سے اس کو مرتب کر لیا۔" کتاب کی قیمت تیس روپے تھی۔ اور مولوی صاحب کی اس وقت کی آمدنی اس کتاب کو خریدنے کی اجازت نہ دیتی تھی۔ چنانچہ مولوی صاحب نے منشی صاحب سے وہ کتاب

ایک دن کے واسطے برائے مطالعہ لے لی۔ منشی صاحب کا بیان ہے
کہ دوسرے روز جو میں گیا۔ تو کیا دیکھتا ہوں۔ کہ مولوی صاحب اپنے
مکان کے زیریں حصے میں چراغ جلائے ہوئے بیٹھے ہیں۔ جو تنگ و
تاریک ہونے کی وجہ سے قدرے خنک تھا۔ میں سلام کرکے بیٹھ
گیا۔ مولوی صاحب نے شکریہ کے ساتھ کتاب واپس کر دی۔ میں
نے عرض کی۔ حضور دن کو چراغ جلائے بیٹھے ہیں۔ کیا ماجرا ہے۔
فرمانے لگے۔ کچھ نہیں۔ ابھی ابھی فارغ ہُوا ہُوں۔ کل تم جس وقت
کتاب دے گئے تھے۔ میں اُسی وقت بازار سے کاغذ لے آیا تھا۔
اور اس وقت سے متواتر یہاں بیٹھا ہوں۔ چنانچہ بحمداللہ ساری
کتاب تمام و کمال مع جدول بجدول نقل کرکے ابھی فارغ ہُوا ہُوں۔
کل سے کھانا بھی نہیں کھایا۔ یہ کہکر ایک کاغذ کا وزنی بلندہ میرے
سامنے رکھدیا۔" جب اقبال نے یہ واقعہ سُنا۔ تو وہ کتاب جرمنی
سے منگواکر مولوی صاحب کی خدمت میں پیش کر دی۔ اقبال نے
جب تحصیل علم کا آغاز کیا۔ تو اسی وقت سے اس کا ہاتھ میر حسن مرحوم
کی عالمانہ غور و پرداخت کے سپرد کر دیا گیا۔ اس زمانے میں مسلمانوں
کے بچے انگریزی سکولوں میں تعلیم پانے کے ساتھ ساتھ مساجد میں
بھی پڑھا کرتے تھے۔ تاکہ علوم مذہبی میں بھی اچھی خاصی دسترس
حاصل ہو۔ چنانچہ یہی حال اقبال کا بھی تھا۔ جب اقبال چوتھی
جماعت میں تعلیم پا رہے تھے۔ تو ایک دن ان کے والد مولوی صاحب

کے پاس آئے۔ اور کہا۔ میں نے اب یہ فیصلہ کیا ہے۔ کہ بچے کو سکول کی تعلیم دینے کے بجائے آپ دینیات کا درس دیا کریں۔ اور آئندہ یہ مدرسہ جانے کے بجائے مسجد ہی میں پڑھا کرے۔ مولوی صاحب مسکرائے۔ اور فرمایا۔ "بچہ مسجد میں پڑھنے کے لئے نہیں۔ بلکہ مکتب میں پڑھنے کے لئے پیدا ہوا ہے۔ اور یہ مدرسہ ہی میں پڑھے گا۔ بات دراصل یہ ہے۔ کہ اُستاد اپنی حقیقت شناس آنکھوں سے اس ہونہار بچے کے روشن مستقبل کو دیکھ رہا تھا۔ مگر جو کچھ آنکھ دیکھ رہی تھی۔ اُسے لب پر لانا نہ چاہتا تھا۔

یہ درست ہے۔ کہ قابلیت کے جوہر کہیں دبے نہیں رہتے۔ کیا تعجب ہے۔ کہ اقبال مسجد میں تعلیم پانے کے باوجود بھی اسی طرح آسمانِ شہرت پر چمکتے۔ مگر یہ واقعہ مولوی صاحب کے اقبال کو کہلانے کا واحد کفیل ضرور ہو سکتا ہے۔

اقبال ایک مرتبہ ایک مرض میں مبتلا ہو کر دہلی علاج کے لئے گئے۔ اور مولوی صاحب بھی علیل تھے۔ شاگرد کی علالت کا اُن پر بہت زیادہ اثر تھا۔ چنانچہ اپنے ایک شاگرد کا یہ فرض قرار دے دیا تھا۔ کہ وہ روزانہ سٹیشن پر جا کر "انقلاب" خرید لایا کرے۔ اور مولوی صاحب کو اقبال کی علالت کے متعلق خبریں پڑھ کر سنایا کرے۔ لہذا ایسا ہی ہوتا۔ یہ تو اُستاد کی شاگرد نوازی تھی۔ اب شاگرد کی اُستاد پرستی ملاحظہ ہو۔

جب گورنمنٹ نے اقبال کو سر اقبال بنانے کا ارادہ کیا۔ تو گورنر پنجاب کی طرف سے اس عنایتِ خسروانہ کے ایما کا اظہار کیا گیا۔ اقبال نے شکریہ ادا کیا۔ لیکن ایک شرط پیش کی۔ کہ مجھے یہ خطاب بسر و چشم منظور ہے۔ مگر اس شرط پر کہ میرے اُستاد کو شمس العلماء کا خطاب دیا جائے۔ گورنر کی طرف سے جواب ملا۔ کہ ایسے شخص کو کیونکر خطاب دیا جا سکتا ہے۔ جس کی نہ کوئی تالیف نہ تصنیف نہ دوسرا کوئی کارنامہ۔ اقبال نے کہا۔ وہ ایسی شخصیت نہیں۔ جو تالیف و تصنیف کی محتاج ہو۔ جس شخص نے میرے جیسا شخص پیدا کر دیا۔ اس کی قابلیت میں بھی کوئی کلام ہو سکتا ہے۔ آخر گورنمنٹ کو مجبور ہو کر شمس العلماء کا خطاب دینا پڑا۔

اُستاد اور شاگرد نے ایک موقع پر باہم طبع آزمائی کی ہے۔ جبکہ سر سید مرحوم کی وفات ہوئی۔ یہ طبع آزمائی تاریخ وفات کے سلسلہ میں تھی۔ اُستاد نے "غفرلہ" کے لفظ سے سالِ وفات نکالا۔ اور شاگرد نے قرآن مجید کی ایک پوری آیت تلاش کی۔ مولوی صاحب والی تاریخ لوحِ مزار پر کندہ ہوئی۔ اس موقع پر ہندوستان کے تمام شعرا نے تاریخ وفات کے لئے ایڑی چوٹی کا زور لگایا۔ لیکن کامیاب تاریخ مولوی صاحب مرحوم کی ثابت ہوئی۔

اقبال کی شخصیت

غالب کہتا ہے ؎

عمرہا ے چرخ بگردد، کہ جگر سوختہ
چوں من از دودۂ آتش نفساں برخیزد

یہ بالکل درست ہے۔ لیکن اقبال جیسے آتش نفس کی پیدائش کے لئے کئی دور گزرنے کے بعد انتظار ہونا چاہیئے۔ پھر بھی یقین نہیں ہوسکتا۔ کہ ایسی ہستی دوبارہ عالم وجود میں آئے گی۔ اور اگر ایسی ہستی کئی دور گزرنے کے بعد بھی عالم وجود میں آجائے۔ تو اس کو خدا کی رحمت سمجھنا چاہیئے۔

اقبال کی زندگی میں عظمت و برتری اور شہرت و ہردلعزیزی کی ہر اک متاع گرانمایہ موجود تھی۔ موجودہ دور میں کوئی ایسی شخصیت نہ تھی۔ جس کے استقبال کے لئے انسانی قلوب کے دروازے اس طرح کھلے ہوئے ہوں۔ جیسے اقبال کے لئے۔ یہ وہ شخصیت تھی۔ جس کی ہر آواز کانوں کے ذریعہ دل تک پہنچی۔ اور خون کے اندر جذب ہوکر خیالات و افکار اور مقاصد و عزائم کی دنیا میں نئی سے نئی بہار کا سامان لے کر جلوہ افروز ہوئی۔ اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ کہ اقبال نے اپنی آواز تمام دنیا میں پہنچانے کی کوشش کی۔ لیکن دنیا اس کو سمجھنے سے قاصر رہی۔

وجہ یہ تھی۔ کہ اس کی نغمہ ریزیوں کے مقام ومحل کا اندازہ کرنا ہر دماغ کا کام نہ تھا۔ البتہ جن لوگوں نے اس کے نغمات سے کیف حاصل کیا۔ ان کے دلوں میں یہ تڑپ ضرور پیدا ہوگئی۔ کہ پھر یہ آواز ان کے کانوں سے ٹکرائے۔ اور وہ اس سے متواتر مستفید ہوتے رہیں۔

اقبال کے حالات میں بہت زیادہ تبدیلیاں ہوئیں۔ ولایت جانے سے پہلے وہ "پروفیسر شیخ محمد اقبال" تھے۔ ولایت کی واپسی پر وہ "ڈاکٹر شیخ محمد اقبال" تھے۔ آغاز شاعری میں وہ ایک حساس، جدت طراز اور خوش بیاں شاعر تھے۔ اور دوسرے دور میں ملت اسلامیہ کی عظمت رفتہ کو واپس لانے کے پُرتاثیر داعی بن گئے۔ تیسرے دور میں ان کی زبان نے قوموں اور جماعتوں کی زندگی کے حقائق کی ترجمانی کی۔ اور وہ دور حاضرہ کے مصلح اعظم اور حکیم امم وملل ہوگئے۔ اقبال کی یہ خصوصیت زیادہ قابل ذکر ہے۔ کہ وہ دنیوی وجاہت کے کبھی طلبگار نہ ہوئے۔ لیکن دنیوی وجاہت ہمیشہ ان کے قدم چومتی رہی۔ دنیا کے موجودہ حکمرانوں اور بادشاہوں نے ان کی ذات سے براہ راست تعلقات پیدا کرنا باعث فخر سمجھا۔ لیکن ان تمام ارتقائی منازل میں ان کا طریق زندگی وہی رہا۔ جو پہلے دن اختیار کرلیا تھا۔ اقبال کی بارگاہ گیرو دار اور حاجب و دربان سے یکقلم پاک تھی۔ اگر کوئی آیا۔ تو اُسے باریابی کے لئے اجازت کی

ضرورت نہ تھی۔ اگر کوئی آکر بیٹھ گیا۔ تو گھنٹوں بیٹھا رہے۔ کوئی ممانعت نہیں۔ اور اگر کوئی نہیں آیا۔ تو اس کے بلانے پر اصرار نہ تھا۔ البتہ جن لوگوں پر خاص شفقت تھی۔ انہیں دن میں کئی کئی بار بلا تکلف بلا لیتے۔ اور بعض اوقات تو گھنٹوں اُٹھنے نہ دیتے تھے۔ جب وہ عالمگیر شہرت کے مالک نہ تھے۔ اس وقت بھی یہی حال تھا۔ اور جب تمام دنیا کے محبوب بن گئے۔ اس وقت بھی یہی حال تھا۔

اقبال جیسے حساس آدمی بہت کم دیکھنے میں آئے۔ بلکہ اگر یہ کہا جائے۔ کہ وہ سراپا احساس تھے۔ تو مبالغہ نہ ہوگا۔ اس کے علاوہ رقیق القلب بھی بہت زیادہ تھے۔ بالخصوص حضور سرور کائنات صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کا اسم پاک زبان پر آتے ہی آنکھوں سے آنسو جاری ہو جاتے۔ حقیقت یہ ہے۔ کہ حضرت ختمی مرتبت صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات پاک کے ساتھ اقبال کو وہ عشق تھا۔ جو بیان کا متحمل نہیں۔ اقبال کی نظموں میں جو اشعار حضور انور صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کے متعلق ہیں۔ اُن کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ اور ان میں سے ایک شعر بھی ایسا نہیں جسے اُنہوں نے سنایا ہو۔ اور سناتے وقت آنکھوں سے آنسو نہ جاری ہوئے ہوں۔ بعض اوقات وجدانی کیفیت میں از خود شعر سنانے لگتے تھے۔ لیکن اگر کوئی شعر نعتیہ آجاتا۔ تو فوراً آنکھوں سے آنسو

جاری ہو جاتے۔ اور اس رقت کا سلسلہ دیر تک جاری رہتا۔ یہاں تک کہ باقی اشعار سننے سے حاضرین محروم رہ جاتے تھے۔

اقبال کے تفصیلی حالات سے وہی زیادہ واقف ہو سکتا ہے۔ جس کو زیادہ قربت کا شرف حاصل ہوا ہو۔ میں نو سال سے لاہور میں قیام پذیر ہوں۔ اس دوران میں زیادہ سے زیادہ پندرہ سولہ مرتبہ باریابی کا موقعہ ملا۔ اس سے یہ نہ سمجھنا چاہیئے۔ کہ ان کی بارگاہ میں باریابی نہ ہوتی تھی۔ وہ تو ایسی بارگاہ تھی۔ کہ ہر خاص و عام بلا روک ٹوک ہر وقت جا سکتا تھا۔ یہ میری ہی بدقسمتی تھی۔ کہ اتنے لمبے عرصہ میں صرف پندرہ سولہ مرتبہ اس عظیم الشان ہستی کے فیوض سے مستفید ہوا۔ میری نسبت جناب سالک مدیر انقلاب اقبال کے حالات پر زیادہ روشنی ڈال سکتے ہیں۔ چنانچہ ۱۴ اپریل ۱۹۳۸ء کے انقلاب میں وہ لکھتے ہیں۔

"حضرت علامہ اقبال کسی ایک دور۔ ایک ملک اور ایک قوم کی شخصیت نہ تھے۔ بلکہ وہ عالمگیر شخصیت کے مالک تھے۔ دنیا کا بڑا حصہ محض انہیں ایک نادر روزگار شاعر کی حیثیت میں جانتا ہے۔ لیکن جن خوش نصیبوں کو اس دریائے فیض کے کنارے پر اپنی زندگیاں گزارنے کی سعادت نصیب ہوئی۔ وہی جانتے ہیں۔ کہ شاعری کا بہتر سے بہتر تصور بھی قائم کر لیا جائے۔ تو حضرت

علامہ کی ذاتِ گرامی پر اس کا اطلاق اس شخصیتِ عظمیٰ کی وسعتِ زمان و مکان کے اعتبار سے کس درجہ نارسا تھا۔ "سول" نے لکھا ہے۔ کہ جبتک اردو اور فارسی کا ایک لفظ بھی دنیا میں بولا جاتا رہے گا۔ اس وقت تک حضرتِ علامہ کی ذاتِ گرامی کی یاد بحیثیتِ شاعر تازہ رہیگی۔ یہ خیال بلاشبہ درست ہے۔ لیکن ہم کہتے ہیں کہ دنیا میں جب تک علم و حکمت باقی رہیں گے۔ جبتک انسانیت کی تحسین و اصلاح کا سلسلہ جاری رہے گا۔ اس وقت تک اس حکیم یگانہ اور اس مصلح اعظم کی یاد تازہ رہے گی۔ اس لئے۔ کہ عالمِ انسانیت کی صلاح و فلاح کے سمندر میں جتنا بڑا تہیج و تحرک حضرتِ علامہ کی ذاتِ گرامی نے پیدا کیا۔ اتنے بڑے تہیج کی مثال صدیوں میں بھی نہیں ملتی۔ حضرتِ علامہ ہندوستان کی ایک غریب قوم کے فرد تھے۔ وہ اس دور میں پیدا ہوئے۔ جبکہ یہ قوم اجتماعی زندگی کے تمام دائروں میں تباہ حال تھی۔ اس میں اوپر اُٹھنے۔ ابھرنے اور اس آسمان کے نیچے عزت مندانہ مقام تلاش کرنے کی ہمت اور سکت موجود نہ تھی۔ اس دور میں کئی بزرگ پیدا ہوئے

جنہوں نے اپنے اپنے خیال اور مذاق کے مطابق
اس قوم کی دستگیری اور رہنمائی کی کوششیں کیں۔
کسی نے تعلیم کو سنبھالا۔ کسی نے سیاسی خدمت کا
دائرہ اختیار کیا۔ کسی نے مذہبی احیا کو اپنا وظیفہ قرار دے
لیا۔ ان سب کی کوششیں مشکور ہیں۔ ان سب کی
ہستیاں واجب الاحترام ہیں۔ لیکن حضرت علامہ اقبال
رحمۃ اللہ علیہ کا دائرہ خدمت سب سے زیادہ وسیع اور
سب سے بڑھ کر اہم تھا۔ انہوں نے قومی زندگی کے
سرچشمے میں بے پناہ تحرک پیدا کیا۔ دلوں کو سچی تڑپ
بخشی۔ زندگی کے جذبات کو استقلال و استحکام دیا۔
دماغوں میں بلندی و رفعت کی طلب پیدا کی۔ قوم کے
مزاج۔ مذاق اور فطرت کو بدل کر اس مقام پر پہنچا دیا۔
جہاں سے عزت مندانہ زندگی کی سرحد شروع ہوتی
ہے۔ مسٹر جناح نے جو یہ کہا ہے۔ کہ حضرت علامہ
مرحوم کی عظیم الشان خدمات ملک و ملت اتنی بے شمار
ہیں۔ کہ انہیں بلا تکلف بڑے سے بڑے ہندوستانی
کی خدمات کے مقابلہ میں لایا جا سکتا ہے۔ تو یہ درحقیقت
اسی حقیقت کی طرف اشارہ ہے۔ علامہ مرحوم دور حاضر
کے سب سے بڑے مسلمان تھے۔ وہ زمانہ دور نہیں۔

جبکہ اس حقیقت کا بھی عام طور پر اعتراف کیا جائیگا۔
کہ وہ سب سے بڑے ہندوستانی بھی تھے۔

"چشم خود بہ بست و چشم ما کشاد"

ان کا پیغام زندگی رہتی دنیا تک باقی رہے گا۔ وہ ان
چند افراد میں سے تھے۔ جن کی قدر و منزلت ان کی
زندگی میں بھی کافی ہوئی۔ وہ عمر بھر زیادہ تر گوشہ نشین
رہے۔ اور بہت کم پبلک میں آئے۔ لیکن دنیا کی
بڑی بڑی شخصیتیں ان کے زاویۂ عزلت میں جا کر
فیضیاب ہونا اپنا سب سے بڑا شرف سمجھتی رہیں۔
ان کی بیماری کی اطلاعات بالاہتمام روکی گئیں۔ اور
ان کی موت دفعتاً ہوئی۔ موت سے صرف بارہ چودہ
گھنٹے بعد انہیں آغوش خاک میں سلا دیا گیا۔ لیکن ان
کے جنازے میں ساٹھ ستر ہزار آدمی شریک ہوئے۔
اور ان میں دینوی وجاہت کے بڑے بڑے پیکر
شامل تھے۔ یہ سب کچھ اسی بات کا ثبوت ہے۔ کہ
ان کی قدر و منزلت کے شعور و احساس سے کوئی
قلب بھی خالی نہ تھا۔ لیکن ان عظمت و رفعت اور
جلالت قدر کا حقیقی دور اب شروع ہوا ہے۔ وہ
زندگی میں مجاہدانہ عزائم و مقاصد کے سب سے

بڑے داعی تھے۔ لیکن ان کی فطرت سراپا محبت تھی۔
دنیا کے عظیم الشان انسانوں میں سے وہ اس قلیل الافراد
گروہ مقدس کے ایک فرد تھے جنہوں نے حتی الامکان
کسی کی خفیف سی دل آزاری بھی گوارا نہ کی۔ وہ کسی
کے بھی رقیب نہ بنے۔ لیکن ایسے لوگوں کی کمی نہ تھی
جو ان کی عظمت و جلالت کو دیکھ کر انہیں اپنا رقیب
سمجھتے تھے۔ اب رقابت کے اس وہم کے لئے بھی
گنجائش باقی نہیں رہی۔ اب وقت آیا ہے۔ کہ دنیا
اقبال کو اس کے حقیقی رنگ میں دیکھے اب وقت
آیا ہے۔ کہ اس کے حقیقی کام کے تمام جوہر آشکارا
ہوں۔ اب اس نادر روزگار شخصیت کی عظمت کے
صحیح اندازوں کا دور شروع ہوا ہے"

یہ تو تھا مدیر انقلاب کا بیان۔ اب میں چند ایسی تحریریں پیش کرتا ہوں۔ جن میں اقبال ڈے کا خیر مقدم ایسی ہستیوں کی طرف سے کیا گیا ہے۔ جو بذات خود بھی موجودہ دور میں نادر روزگار ہیں۔

آنریبل سر عبدالقادر ممبر انڈیا کونسل لندن

"ہمارے قومی شاعر و فلاسفر نے دنیا کو عزت سے زندگی بسر کرنا اور بہادر کی موت مرنا سکھایا..... مجھے امید ہے۔ کہ آپ کی کوششیں نظر پسندیدگی دیکھی جائیں گی"

سائز کمیلو گر یا ئی قونصل جنرل اٹلی	میں آپ کو فسطائی حکومت اٹلی کے ارشاد کے مطابق حکومت کا یہ پیغام ارسال کرنے میں مسرت محسوس کرتا ہوں۔ کہ اٹلی حکومت اس موقع پر بیحد مسرت کا اظہار کرتی ہے ——— ڈاکٹر سر محمدؐ اقبال کی معرکہ خیز فغان زندگی مشرق میں زندگی کی روح پھونکنے کی ضامن ہے۔ میں ذاتی طور پر اپنی بے پایاں مسرت کا اظہار کرتا ہوں۔ کہ اس شاعر اعظم کا ولولہ خیز پیغام اس کے بے شمار پڑھنے والوں کے دلوں میں بلا لحاظ اس امر کے کہ وہ کسی سیاسی حد بندی سے تعلق رکھتے ہیں۔ زندگی کی حرارت پیدا کرتا ہے . . . . . .
نواب سر صاحبزادہ عبدالقیوم مرحوم	ڈاکٹر اقبال نے اسلام اور اسلامی تمدن کی کی جو ترجمانی کی ہے۔ اس کے لئے ہماری کئی نسلیں ممنوں ہوں گی۔ خداوند کریم ہمارے پیارے شاعر کو عمر جاوداں نصیب کرے۔ تاکہ اس کی رہبری اور رہنمائی میں اسلامی روایات زندہ رہ سکیں. . . . . .

پنڈت جواہر لال نہرو

یوم اقبال کی تقریب کی خبر سن کر مسرت ہوئی۔ میں اس کی شخصیت کو عزت کی نگاہ سے دیکھتا ہوں۔ اور قابلیت کو خراج تحسین ادا کرتا ہوں۔ اقبال نے ہمیں کتنے اچھے ترانے دیئے ہیں۔

آنریبل سر سکندر حیات خاں وزیر اعظم حکومت پنجاب

میری تمنا ہے۔ کہ یہ تقریب سعید جو ایشیا کے اس نامور مفکر اور عظیم المرتبت شاعر کے اسم گرامی سے منسوب ہے۔ صرف ہندوستان میں ہی نہیں۔ بلکہ تمام ممالک مشرق میں منائی جائے۔ کہ دنیا پر اقبال اور اس کے شعر کی اہمیت اور ایشیائی اقوام کی فرض شناسی روشن ہو جائے۔ پنجاب ہی کی سرزمین کو عالم مشرق کے اس عظیم انشان اور خوش فکر فلسفی کی جنم بھومی ہونے کا فخر حاصل ہے۔ ملت اسلامیہ اگر مدتوں کے جمود کے بعد زندگی کی حرارت سے آشنا ہوئی ہے۔ تو اسی باعث اس کے نظام عصبی میں اقبال کی گرمی موجزن ہے۔ اور ہندوستان عام طور پر جن نئے تصورات و

افکار سے متاثر ہو رہا ہے۔ وہ حقیقت میں اقبال ہی کی فکر کا عکس ہیں.....

ہز ہائنس نواب صاحب بھوپال

تاریخ اس امر کی شاہد ہے۔ کہ فی زمانہ ہمارے فلسفی شاعر کی طرح اسلام کی صحیح تعلیم اور اصولوں کو کسی نے پیش نہیں کیا۔ قدرتی طور پر نئی پود اس کی گرانقدر خدمات کے لئے اظہار تشکر کرتی ہے۔ میں اس تحریک (اقبال ڈے) کے بانی کی کامیابی کے لئے دعاگو ہوں

اقبال کی وفات کے حادثے کے موقع پر ملک کے طول و عرض سے تعزیت کے جو پیغامات اخبارات اور مرحوم کے پسماندگان کو وصول ہوئے اگر وہ تمام درج کئے جائیں۔ تو صرف انہی سے ایک ضخیم کتاب تیار ہو سکتی ہے۔ اس مختصر سی کتاب میں ان سب کی گنجائش نہیں۔ میں صرف چند معزز ہستیوں کے پیغامات نقل کرتا ہوں۔

ڈاکٹر رابندر ناتھ ٹیگور

سر محمد اقبال کی وفات سے ہمارے ادب کو ایک ناقابل تلافی نقصان اٹھانا پڑا ہے۔

کہ وہ ایک ایسے مہلک زخم سے مشابہ ہے
جس کے معالجہ کے لئے مدت مزید کی
ضرورت ہے۔ ہندوستان کا درجہ آج بھی
دنیائے ادب میں بہت پیچھے ہے۔ مگر اس
شاعر کی وفات نے جس کی نظموں کی
شہرت بین الاقوامی تھی۔ اُسے اور بھی
نقصان پہنچایا ہے۔"

سر تیج بہادر سپرو — ابھی دو ماہ کا ذکر ہے۔ کہ میں نے لاہور
میں آپ سے ملاقات کی تھی۔ آپ دنیا
کے ممتاز اور بلند پایہ شاعروں میں سے
تھے۔ آپ کو فارسی اور اردو شاعروں میں
شہرہ آفاق حیثیت حاصل تھی۔ میں گزشتہ
تیس برس سے آپ کی شاعری اور آپ
کی فکر متین کا مداح چلا آرہا ہوں ہندوستان
کو آپ کی وفات نے بہت بڑا نقصان
پہنچایا ہے۔

مسز سروجنی نائیڈو — اگرچہ آج آسمان ادب کے آفتاب
(سر محمد اقبال) کی ضیا پاش مٹی زمین میں
دفن کی جارہی ہے۔ بایں ہمہ آپ کا نہ

مٹنے والا پیغام اپنی اسی شان و جلالت کے ساتھ دنیا کو مستفید کرتا رہے گا۔ مجھے آپ کی وفات سے بیحد صدمہ ہوا ہے۔

مسٹر سبھاش چندر بوس

سر محمد اقبال کی وفات نے ہندوستان کے آسمانِ ادب کو ایک منور ستارے سے محروم کر دیا ہے۔ سر محمد اقبال صرف عظیم المرتبت شاعر اور شہرہ آفاق ادیب ہی نہ تھے۔ ان کی شخصیت کئی ایک لحاظ سے ہندوستان کے لئے باعث افتخار تھی۔ ہندوستان کے لئے یہ نقصان خسارۂ عظیم کی حیثیت رکھتا ہے۔

سر جیمز ایڈیسن قائم مقام چیف جسٹس ہائی کورٹ پنجاب

ہمیں علامہ ڈاکٹر سر محمد اقبال کی وفات کی اندوہ آور اطلاع پاکر بے حد صدمہ ہوا۔ میں چیف جسٹس کی عدم موجودگی میں ان کے قائم مقام کی حیثیت سے اس امر کے اعلان کو نہایت ضروری سمجھتا ہوں۔ کہ عدالت مرافعہ لاہور ہر اس بات سے متفق ہے۔ جو اس وقت تک

علامہ مرحوم کے شایانِ شان لکھی گئی ہے۔
ابھی چند سال کا ذکر ہے۔ کہ مرحوم نے اپنی
صحت کی خرابی کی بنا پر وکالت ترک کر دی
تھی۔ مگر ایک وقت وہ عدالتوں میں شہرہٗ
آفاق حیثیت رکھتے تھے۔ اور ایک ممتاز
قانون دان گنے جاتے تھے۔ آپ بیحد خلیق
تھے۔ آپ کی تقریر نہایت شستہ تھی۔ آپ
کے اطوار نہایت پسندیدہ تھے۔ آپ
عقلِ سلیم کے مالک تھے۔ اور عوام الناس
کے نزدیک بے حد ہر دلعزیز تھے جس حد
تک کہ شاعری کا تعلق ہے۔ آپ کی شہرت
بین الاقوامی تھی۔ آپ کی شگفتگیٔ مزاج اور
متانت و سنجیدگی، جس کا عطر آپ کے
اشعار میں کوٹ کوٹ کر بھرا پڑا تھا۔
اتنی پسندیدہ ہے۔ کہ اس نے ساری
دنیا سے آپ کے لئے خراجِ تحسین وصول
کیا۔ یہ خراجِ تحسین کسی نسل قوم اور مذہب
تک محدود نہ تھا۔ بلکہ ساری دنیا کے
اہم افراد آپ کے مداح تھے۔

آپ کے سیاسی خیالات سے ہمیں کوئی
تعلق نہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے۔ کہ عدالت
ایسے امور سے کسی قسم کا لگاؤ نہیں رکھتی۔
مگر اس وقت پنجاب جس شخص کی وفات
سے اندوہ و تاسف کا مجسمہ بنا ہوا ہے۔ وہ
ایک ایسا قانون دان ادیب اور بلند پایہ شاعر
تھا جس کی شہرت قیامت تک رہے گی۔
عدالت مرافعہ مرحوم کے پسماندوں سے دلی
ہمدردی کا اظہار کرتی ہے۔ میرا خیال ہے
کہ یہ امر ان کے لئے اطمینان کا موجب ہوگا۔
کہ مرحوم کا ماتم صرف وہی (پسماندہ اشخاص)
نہیں کر رہے۔ بلکہ مرحوم کا ماتم کرنے والے
کرۂ ارض کے ہر ایک حصے میں موجود ہیں۔

مسٹر جناح لکھتے ہیں۔ میں سر محمد اقبال کی وفات حسرت آیات
کی اطلاع سنکر بے حد مغموم ہوا ہوں۔
آپ دنیا بھر میں شہرت رکھنے والے ممتاز
شاعر تھے۔ آپ کی نظموں کی وجہ سے آپ
کی شہرت کبھی بھی کم نہ ہوگی۔ آپ نے
اپنے وطن اور مسلم قوم کے لئے اتنی بلند

خدمات انجام دی ہیں۔ کہ وہ ریکارڈ کی حیثیت رکھتی ہیں۔ میرے لئے آپ ڈسٹ کی حیثیت رکھتے تھے۔ آپ کی قیادت۔ آپ کا فلسفہ ہمارے لئے مایۂ ناز تھا جس وقت مسلم لیگ نازک تاریک ترین مراحل سے گذر رہی تھی۔ آپ نے مسلم لیگ کے لئے ایک ناقابل تسخیر قلعہ کا کام دیا تھا۔ ایسی مصیبتوں کے وقتوں میں آپ اپنے عزم سے ایک انچ بھی پیچھے نہیں ہٹے تھے۔

سر ناظم الدین وزیر داخلہ بنگال

علامہ اقبال ایسے وقت میں رحلت فرما گئے ہیں۔ کہ ہمیں ان کی بڑی احتیاج تھی۔ اہ! ہندوستان کا مفکر فرزند اور اسلام کا بڑا فلاسفر نہ رہا۔

مسٹر جسٹس ٹیک چند ہائی کورٹ پنجاب

سر محمد اقبال کی وفات کی وجہ سے ہندوستان کو ایک بین الاقوامی شہرت رکھنے والے بلند پایہ شاعر کی عظیم المرتبت خدمات سے محروم ہونا پڑا ہے۔ میں ڈاکٹر صاحب کو چالیس برس سے جانتا ہوں۔

جبکہ وہ گورنمنٹ کالج لاہور کی ایم۔ اے کلاس میں پڑھتے تھے۔ اور میں اُس وقت انٹرمیڈیٹ میں تھا۔

چودھری سر شہاب الدین

ڈاکٹر صاحب مرحوم کی وفات کی اندوہ گیں خبر میرے لئے بیحد صدمہ کا موجب ہوئی۔ آپ کی وفات کی وجہ سے مشرقی زمین سے ایک بلند پایہ مشرقی شاعر۔ ہندوستان سے ایک قابل اور ہونہار فرزند۔ دنیائے اسلام سے ایک عالم دین اور سیاسی مفکر اور کرۂ ارض سے ایک اہم شخصیت اور بلند پایہ فلاسفر اُٹھ گیا ہے۔

چونکہ آپ دنیا کے مایۂ ناز مفکرین اور دانشمندوں میں سے تھے۔ لہٰذا آپ کی یاد ہمیشہ تازہ رہیگی۔ آپکی نظم۔ آپ کے تخیلات۔ آپ کا ادب۔ آپ کا فلسفہ ہر کڑے وقت میں ہمارے لئے رہنما کا کام کرے گا۔ اور ہمیشہ ہمیں غلط راستے سے صراطِ مستقیم پر لائے گا۔

سر تیج بہادر سپرو کا پیغام

"میں کئی سال سے اقبال کی فارسی اور اُردو شاعری دونوں کا مداح ہوں۔ اس سے کسی کو انکار کی جرأت نہیں ہوسکتی۔ کہ اقبال ایک عدیم النظیر شاعر تھا۔ ایسی شکتی کم شاعروں کو نصیب ہوئی ہے۔ فن کے اعتبار سے بھی وہ اپنے ہم عصروں میں تنہا آپ اپنی مثال تھا۔ اور ہمعصروں کا کیا ذکر ہے۔ میرے خیال میں دنیا کے تمام شاعروں کی صف میں خواہ وہ کسی وقت کے یا کسی ملک کے ہوں۔ اقبال کا درجہ بہت بلند ہے۔ بہت بلند ہے۔"

سپرو

مرض الموت

اقبال مرحوم کی علالت کا سلسلہ دیر سے چلا آتا تھا۔ اور مدت سے جس دن کا کھٹکا لگا ہوا تھا۔ آخر وہ دن آپہنچا۔ اور ضمیمہ روزنامہ انقلاب نے ۲۱ اپریل ۱۹۳۸ء کی صبح کو یہ جانگداز خبر سنائی۔

"علامہ اقبال کئی مہینے سے بیمار تھے۔ ان کے نیازمندوں اور عقیدت کیشوں کو علم تھا۔ کہ بیماری بڑی سخت ہے۔ ڈاکٹروں نے کہدیا تھا۔ کہ یہ علاج ہے۔ اور زندگی برسوں کی نہیں۔ بلکہ مہینوں کی ہے۔ لیکن اس اطلاع کی اشاعت بوجوہ خلاف مصلحت سمجھی گئی۔ اوّل اس لئے۔ کہ مرحوم و مغفور کے دل پر بُرا اثر نہ پڑے۔ دوم۔ اسلئے کہ عیادت کرنے والوں کا ہجوم نہ ہو۔ اور ڈاکٹروں کی سخت ہدایت تھی۔ کہ حضرت علامہ کو زیادہ لوگوں سے ملنے کا موقع بھی نہ دیا جائے۔ تاکہ ان کے دماغ پر کسی قسم کا بوجھ نہ پڑے۔ اور یہ احتیاط بیماری کے اثرات بد کو روکنے کے لئے حد درجہ ضروری سمجھی گئی تھی۔

گزشتہ چار پانچ ماہ کی مدت میں علاج میں کوئی دقیقہ اُٹھا نہ رکھا گیا۔ مغربی طب کے ماہروں میں سے ڈاکٹر محمد یوسف۔ ڈاکٹر یار محمد خاں۔ ڈاکٹر کیپٹن الٰہی بخش۔ ڈاکٹر جمعیت سنگھ اور کرنیل

امیر چند کا علاج ہوا۔ ان میں سے اکثر اصحاب روزانہ اور بعض اوقات دن میں دو دو مرتبہ پہنچتے رہے۔ یونانی اطباء میں سے لقمان الملک حضرت حکیم عبدالوہاب صاحب عرف نابینا برسوں سے حضرت علامہ کے معالج تھے۔ وہ حیدرآباد سے دواء بھی بھیجتے رہے۔ حضرت حکیم محمد حسن صاحب قرشی پرنسپل طبیہ کالج لاہور نے جس عقیدت، محبت۔ اور اہتمام کے ساتھ علاج کیا۔ اس ذکر کے لئے دفتر چاہیئے۔ حضرت حکیم صاحب خود قریباً روزانہ کئی کئی گھنٹے حضرت علامہ مرحوم کی خدمت میں موجود رہتے۔ زیادہ تر اپنے ہاتھ سے دوائیں کھلاتے۔ اور یہ سلسلہ ایک دو دن نہیں۔ بلکہ مہینوں جاری رہا۔ لیکن اس بلند منزلت اور نادر روزگار ہستی کا ہم سے ہمیشہ کے لئے جدا ہو جانا مقدر تھا۔ حکیم محمد حسن صاحب قرشی کے علاج سے درمیان میں بہت فائدہ ہوا۔ لیکن چھ سات روز سے دفعتاً پھر طبیعت خراب ہوگئی تھی۔ عام طور پر بتایا جاتا تھا۔ کہ دل پھیل گیا ہے۔ اور اس کی ایک نالی خراب ہوگئی ہے۔ جس کی وجہ سے بعض اوقات ضعف قلب کے دورے ہوتے تھے۔ جن سے ضیق النفس کی سی کیفیت طاری ہوتی تھی۔ تین روز بلغم کے ساتھ خون آتا رہا۔ جسم کے بائیں حصے پر ورم ہوگیا۔ ۲۰ اپریل کی شام کو ڈاکٹروں نے بتایا۔ کہ حالت زیادہ خراب ہے۔ رات کے ساڑھے بارہ بجے تک چند

عقیدت مند حضرتِ علامہ کے پاس بیٹھے رہے۔ اور بظاہر ایسا معلوم ہوتا تھا۔ کہ طبیعت اچھی ہے۔ رات کے وقت کسی قدر نیند بھی آگئی۔ تین بجے کے قریب درد شروع ہوا۔ پانچ بجے کے قریب راجہ حسن اختر کو جگا کر حکیم قرشی صاحب کی طرف بھیجا گیا۔ اور حضرت علامہ مرحوم نے راجہ صاحب کو اپنے یہ دو شعر سنائے۔ جو قریباً چار ماہ پیشتر کہے گئے تھے۔ ؎

سرودِ رفتہ باز آید کہ ناید
نسیمے از حجاز آید کہ ناید
سر آمد روزگارے ایں فقیرے
دگر دانائے راز آید کہ ناید

راجہ صاحب یہ اشعار سُنکر پانچ بجنے کے چند منٹ بعد حکیم صاحب کی طرف گئے۔ سوا پانچ بجے کے قریب ایک دھچکا سا محسوس ہوا۔ حضرتِ مرحوم کا محبوب اور دیرینہ ملازم علی بخش اس وقت دبا رہا تھا۔ اور چند سیکنڈ میں وہ زبان ہمیشہ کے لئے خاموش ہوگئی۔ جس نے ہزاروں۔ لاکھوں انسانوں کو زندگی کا پیغام دیا تھا۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ۔

ڈاکٹروں نے کئی مہینے پہلے بتا دیا تھا۔ کہ بیماری مہلک ہے۔ یہ بھی کہہ دیا گیا تھا۔ کہ حضرتِ مرحوم کو زیادہ گفتگو کا موقع نہ دیا جائے۔ تاکہ تکان نہ ہو۔ حضرتِ مرحوم زیادہ چلنے پھرنے

کے عادی کبھی بھی نہ تھے۔ بلکہ عموماً کرسی پر بیٹھے رہتے یا پلنگ پر لیٹے رہتے اٹھتے۔ بیماری کے دنوں میں صرف لیٹے رہتے۔ یا گاؤ تکیے کے سہارے کبھی کبھی پلنگ پر بیٹھ جاتے۔ جسم اگرچہ کافی کمزور ہو گیا تھا۔ لیکن چہرے کی کیفیت بدستور تھی۔ اس میں قطعاً کوئی فرق نمایاں نہ تھا۔ اور دماغ آخری دم تک بالکل درست رہا۔ دماغ ہر کام اسی طرح کرتا رہا۔ جس طرح زندگی کے ایام صحت میں کرتا تھا۔ اور وفات کے بعد ایسا معلوم ہوتا۔ کہ اطمینان کے ساتھ سو گئے ہیں۔ چہرے پر قطعاً کوئی شکن نہ تھی۔ سکرات موت عام دوران پر آیا ہی نہیں۔ وہ خود بیماری کے دنوں میں فرمایا کرتے تھے۔ ؎

نشان مرد مومن با تو گویم
چو مرگ آید تبسم بر لب اوست

اور موت سے ایک دن پہلے فرمایا تھا۔ کہ میں موت سے نہیں ڈرتا۔ بلکہ خنداں چہرے کے ساتھ اس کا استقبال کرونگا۔

موت کے ساتھ ہی فرمانروائے بہاولپور۔ فرمانروائے بھوپال سر اکبر حیدری وزیر اعظم دولت آصفیہ۔ حکیم نابینا صاحب۔ اعلیٰ حضرت شہریار افغانستان۔ وزیر اعظم افغانستان۔ وزیر حربیہ افغانستان اور افغان کونسل جنرل وغیرہ کو تار دیئے گئے۔ سر سکندر حیات خاں وزیر اعظم پنجاب۔ لیگ کے اجلاس کے لئے

کلکتہ تشریف لے گئے تھے۔ اور کلکتہ سے روانہ ہو چکے تھے۔ انہیں رائے بریلی اور لکھنؤ کے سٹیشن ماسٹروں کی معرفت تار دیئے گئے۔ اعلیٰ حضرت فرمانروائے بہاولپور کی طرف سے بارہ بجے کے قریب تعزیت کا تار آگیا۔ نیز اعلےٰ حضرت نے پروفیسر کرامت اللہ آف چیفس کالج کو اپنی طرف سے نمائندہ بنا کر جنازے میں شرکت کے لئے بھیجا۔ سر سکندر حیات خاں نے لکھنؤ سے تار بھیجا۔ کہ حضرت علامہ کی بے وقت موت کی دل شگاف خبر سے بے حد قلق ہوا۔ دنیائے اسلام کے ناقابل تلافی نقصان عظیم میں مشرق و مغرب دونوں یکساں شریک ہونگے۔

علامہ کی موت کی خبر بجلی کی سرعت کے ساتھ شہر میں پھیل گئی۔ تمام اسلامی حلقوں میں ماتم کے طور پر دکانیں بند ہوگئیں۔ لوگ جوق در جوق حضرت مرحوم کی کوٹھی پر پہنچنے لگے۔ سارا دن آمد و رفت جاری رہی۔

ضمیمہ انقلاب"

آخری ارشادات

علامہ مرحوم کو چند دن پہلے ہی وقت موعود کے نزدیک آنے کا احساس ہو رہا تھا۔ چنانچہ آپ بعض اوقات اس کے متعلق کہہ بھی دیتے تھے۔

مثلاً ۲۰۔ اپریل کی شام کو سات بجے آقائے مرتضیٰ احمد خاں میکش (مدیر احسان) عیادت کے لئے گئے۔ اور ایک گھنٹہ مرحوم کی خدمت میں بیٹھے رہے۔ اس دوران میں علامہ کا بیٹا جاوید جو تیرہ چودہ سال کا بچہ ہے۔ کمرہ میں آگیا۔ علامہ نے اس سے مخاطب ہو کے فرمایا۔ کہ بیٹا تم میرے پاس آکر بیٹھا کرو۔ میں شاید کتنے دن کا مہمان ہوں۔ اس پر حاضرین میں سے کسی نے کہا۔ کہ بچہ ہے۔ آپ کو علیل دیکھ کر گھبرایا سا رہتا ہے۔ علامہ نے کہا۔ کہ اسے ہر افتاد کا مردانہ وار مقابلہ کرنے کی ہمت پیدا کرنی چاہیئے۔

ازاں بعد علامہ مرحوم نے چودہری محمد حسین سے مخاطب ہو کر فرمایا۔ کہ جاوید نامہ کے آخر میں "خطاب بہ جاوید" کے عنوان سے میں نے چند باتیں جاوید کے لئے لکھی ہیں۔ ان میں ایک جگہ یہ بھی لکھا ہے۔ کہ عصر حاضر میں قحط الرجال ہے۔ اور مردان باخدا کا ملنا مشکل ہو رہا ہے۔ اگر تم خوش قسمت ہوئے۔

تو تمہیں کوئی صاحب نظر مل جائے گا۔ اور اگر نہ ملا۔ تو تم میرے ہی نصائح پر عمل کرنا۔

علامہ اقبال نے فرمایا۔ کہ میرے مرنے کے بعد جاوید جب جوان ہو۔ تو اُسے اِن اشعار کا مطلب سمجھا دینا۔

ازاں بعد آقائے مرتضےٰ احمد خاں نے آنے کے لئے اجازت طلب کی۔ علامہ مرحوم نے مصافحہ کے لئے ہاتھ بڑھایا۔ جس پر آقائے موصوف کا دِل دہل گیا۔ کیونکہ ان کا بیان ہے۔ کہ گزشتہ ۱۸ سال کے دوران میں مرحوم نے کبھی رخصت ہوتے وقت ہاتھ نہیں ملایا تھا۔ اور میں نے کبھی ہاتھ بڑھا کر مصافحہ کرنے کی جرأت نہ کی تھی۔

اسی شام کو حضرتِ علامہ مرحوم نے ایک شخص کے استفسارِ حال کے جواب میں ارشاد فرمایا۔ کہ ان تکلیفوں سے بہت جلد نجات حاصل کرنا چاہتا ہوں۔

احسان۔ ۲۴ اپریل

مدفن کے مقام کا فیصلہ

حضرتِ علامہ رحمۃ اللہ علیہ کی زندگی میں اُن کے مدفن کے متعلق نیاز مندوں کے حلقے میں کبھی کوئی قطعی گفتگو نہیں ہوئی تھی۔ البتہ مختلف اصحاب کے دِل میں خیال تھا۔ کہ مدفن

کے لئے کوئی ایسی جگہ تلاش کی جائے۔ جس کے ساتھ باغ کا انتظام بھی ہو سکے۔ بعض نیاز مندوں کی رائے تھی۔ کہ ایسی جگہ تجویز کی جائے جس کے ساتھ ایک عالیشان ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کا بندوبست ہو سکے۔ لیکن یہ خیال و آرا دماغوں سے نکل کر زبانوں پر بھی بہت کمتر آئے۔ چہ جائیکہ ان کے متعلق کوئی قطعی فیصلہ ہو سکتا۔ اور سچی بات یہ ہے۔ کہ حضرتِ مرحوم کی زندگی میں کسی کو اس قسم کے مسائل طے کرنے کی ہمت نہیں ہو سکتی تھی۔ انتقال سے نو دس گھنٹے پیشتر جب ڈاکٹروں نے بتا دیا۔ کہ حالت اطمینان بخش نہیں ہے۔ اور زیادہ سے زیادہ دو چار دن کی زندگی باقی ہے۔ تو چودھری محمد حسین صاحب ایم۔ اے اور ڈاکٹر مظفر الدین نے یہ طے کیا۔ کہ حضرتِ مرحوم کو شاہی مسجد کے کسی حجرے میں دفن کیا جائے۔

انتقال سے ایک گھنٹہ بعد نیاز مندوں نے چودھری محمد حسین کی سرکردگی میں اس تجویز کو جامۂ عمل پہنانے کی کوشش کی۔ اور سب سے پہلے وہ سر سکندر حیات خاں وزیر اعظم پنجاب کی خدمت میں پہنچے۔ جو ۲۱ اپریل ۱۹۳۸ء کی صبح کو کلکتہ سے لاہور پہنچنے والے تھے۔ لیکن انہیں مقررہ پروگرام کے خلاف مزید ایک روز کے لئے کلکتہ میں ٹھیرنا پڑا۔ اس لئے یہ معلوم ہوا۔ کہ اب وہ ۲۱ کے بجائے ۲۲ کی صبح کو لاہور پہنچیں گے۔

اور یہ غیر ممکن تھا۔ کہ حضرت مرحوم کی میت کو ۲۲۔ تک دفن نہ کیا جاتا۔ ایک مشکل یہ تھی۔ کہ وزیر اعظم صاحب کلکتہ میں نہ تھے۔ کہ ٹیلیفون یا تار کے ذریعہ سب کچھ طے کر لیا جاتا۔ بلکہ وہ اس وقت سفر میں تھے۔

اس کے بعد ضروری ہو گیا۔ کہ انجمن اسلامیہ کے کارپردازوں اور دوسرے اکابر سے مشورہ کیا جائے۔ چنانچہ سید محسن شاہ صاحب ڈاکٹر خلیفہ شجاع الدین صاحب۔ خاں سعادت علی خاں۔ میاں نظام الدین صاحب۔ میاں امیر الدین صاحب۔ مولانا غلام مرشد صاحب۔ چوہدری محمد حسین صاحب اور سالک و قہر اصل رائے پر متفق ہو کر بتجویز مدفن کے لئے شاہی مسجد پہنچے۔ مسجد کے بڑے دروازہ کی سیڑھیوں پر پہنچتے ہی بائیں جانب کا قطعہ زمین بہت موزوں معلوم ہوا۔ اور حجرے کا خیال ترک کر کے سب کی یہ رائے ٹھیری۔ کہ اس جگہ دفن کی اجازت لی جائے۔ اس لئے کہ یہ جگہ مسجد سے ملحق بھی تھی۔ اور اس میں یہ سہولت بھی تھی۔ کہ عام مسلمانوں کے علاوہ غیر مسلم بھی زیارت مزار سے بلا تکلف مستفید ہو سکتے تھے۔

یہ طے کر کے پانچ آدمیوں کا وفد ہز اکسیلنسی سر ہنری کریک گورنر پنجاب کی خدمت میں پہنچا۔ یہ جگہ مسجد کی طرح آثار قدیمہ کی نگرانی میں تھی۔ اور اس کے لئے دہلی سے اجازت منگانی ضروری

تھی۔ لیکن سرسبزی کریک نے انتہائی ہمدردی سے کام لے کر جلد سے جلد ہر ممکن انتظام فرما دیا۔ ان کی توجہ سے بارہ بجے تک اجازت مل گئی۔ اسی وقت قبر کی تیاری شروع ہو گئی۔ چار بجے تک اجازت کے کاغذات موصول ہو گئے۔ سرسبزی کریک کی یہ ہمدردی انتہائی ممنونیت کی مستحق ہے۔ اور ہمیں یقین ہے۔ کہ مسلمان اس ہمدردی کو ہمیشہ ممنونیت کے ساتھ یاد رکھیں گے۔

اس جگہ کے متعلق صرف اتنا عرض کر دینا کافی ہے۔ کہ بادشاہ اور تاجدار بھی اس میں دفن ہونا باعث صد اعزاز سمجھیں۔ ایک طرف عالمگیری مسجد ہے۔ جو اپنی وسعت۔ سادگی اور شکوہ کے اعتبار سے عالمگیر اعظم کے دل و دماغ کا نہایت عمدہ نقشہ پیش کر رہی ہے۔ اور جس کی مرمت و درستی کیلئے سر سکندر حیات خاں وزیر اعظم پنجاب کی کوشش سے حال ہی میں گیارہ لاکھ روپے کی گرانبہا رقم منظور ہوئی ہے۔ دوسری طرف شاہی قلعہ ہے۔ مدفن والے قطعہ زمین سے بالکل ملحق حضوری باغ ہے جس کے وسط میں سنگ مرمر کی وہ بارہ دری کھڑی ہے۔ جو سکھوں کے عہد میں جہانگیر کے مقبرہ پر سے اتار کر لائی گئی تھی۔ حضرت علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ کی زندگی کے کام کو پیش نظر رکھتے ہوئے محض لاہور ہی میں نہیں۔ بلکہ پنجاب بھر میں اس سے بہتر

ماحول اور اس سے بہتر فضا قطعاً نہیں مل سکتی تھی۔ جو ساری کی ساری یکقلم اسلام کے دورِ عروج کی یادگار ہے۔ اور یہ وہ مقام ہے۔ جسے مسلمانوں کی عظمت و اقتدار کے دور میں بھی کسی کا مدفن بنانے کی جرأت نہ ہوئی۔ مرحوم و مغفور اقبال کی وصایت اسلامیت اور للّٰہیت ہی کی یہ برکت تھی۔ کہ جو مدفن بادشاہوں اور تاجداروں کے لئے بھی باعثِ صد اعزاز ہوتا۔ لیکن انہوں نے اپنے دورِ عروج و سربلندی میں اُسے حاصل کرنے کی جرأت نہ کی۔ حضرت علامہ رحمۃ اللہ علیہ کو وہ مدفن مل گیا۔ پھر یہ ملاحظہ فرمائیے۔ کہ مسجد کی حفاظت و بقا کے متعلق تا قیامت کوئی تشویش نہیں ہو سکتی۔ اور جبتک مسجد محفوظ ہے۔ مزار اقبال بھی محفوظ رہیگا۔ روزانہ نمازوں کے علاوہ جمعہ کی نماز کے لئے ہزاروں اس مسجد مقدس میں پہنچتے ہیں۔ اور عیدین کی نمازوں میں تو لاکھوں مسلمانوں کا ہجوم ہوتا ہے۔ یہ لوگ مسجد میں جاتے ہوئے اور مسجد سے باہر آتے ہوئے اس مزار کے پاس سے گذریں گے۔ اس طرح اس مقدس ہستی کے لئے دعائے خیر و مغفرت کا سلسلہ متواتر جاری رہے گا۔ جس کی زندگی کا ہر لمحہ کلمہ حق کی سربلندی کے لئے وقف رہا۔ اور جس نے اللہ تعالےٰ کی عطا کی ہوئی تمام نعمتوں کو صرف اسکے دین مقدس کی خدمت گزاری میں صرف کر دیا۔

انقلاب ۲۹ اپریل ۳۸ء

حضرتِ علامہ کی اولاد

حضرتِ علامہ مرحوم کے بڑے صاحبزادے آفتاب اقبال ہیں۔ جو بعض حالات کی وجہ سے مدت سے علیحدہ رہتے ہیں۔ چھوٹے جاوید اقبال ہیں۔ جن کی عمر قریباً تیرہ برس کی ہے۔ سب سے چھوٹی صاحبزادی منیرہ بانو ہے۔ جس کی عمر صرف چھ برس کی ہے۔ حضرتِ مرحوم نے مدت ہوئی ایک وصیت لکھکر رجسٹرار کے پاس محفوظ کرا دی تھی۔ اس میں جاوید اقبال اور منیرہ بانو کے گارڈین چار شخصوں کو بنایا تھا۔ اوّل چودھری محمد حسین ایم۔ اے دوم منشی طاہر الدین صاحب۔ سوم حضرتِ علامہ کے بھتیجے شیخ اعجاز احمد بار ایٹ لا۔ چہارم بچوں کے ماموں خواجہ عبدالغنی صاحب۔ ان میں سے خواجہ صاحب کا انتقال ہو چکا ہے۔ بقیہ تینوں اصحاب اب جمع ہو کر وصیت رجسٹرار سے لیں گے۔ اور اس کے مطابق عمل کریں گے۔

ضمیمہ "انقلاب"

جنازے کی روانگی

شام کے پانچ بجے شاعرِ مشرق علامہ ڈاکٹر سر محمد اقبال مرحوم کا جنازہ آپ کی کوٹھی واقع میورو ڈ سے اٹھایا گیا۔ میورو ڈ پر

فرزندانِ توحید کا ایک بحرِ بیکراں ٹھاٹھیں مار رہا تھا۔ ہجوم کی زیادتی اور مشتاقانِ اقبال کی کثرت کی وجہ سے علامہ مرحوم کی چارپائی سے لمبے لمبے بانس لگا دیئے گئے تھے۔ ہزاروں مسلمان بانسوں سے چمٹے ہوئے تھے۔ جب جنازہ اُٹھایا گیا۔ تو ایک کہرام برپا ہو گیا۔ ہر ایک مسلمان کی آنکھوں سے سمندر اُمڈا چلا آ رہا تھا۔ خواتین کے نالہ و شیون نے آسمان کی خاموش فضا کو ماتم گسار کر دیا تھا۔ کالجوں کے طلباء۔ وکلاء۔ بیرسٹر۔ شاعر۔ ادیب۔ اخبار نویس۔ تاجر وزراء۔ حکامِ اعلیٰ۔ سکولوں کے طلبا۔ اور اساتذہ سب برہنہ سر حسرت و یاس کے متحرک پیکر گردنیں جھکائے بچشم نم جنازہ کے ہمراہ تھے۔

جب جنازہ کوٹھی سے باہر لایا گیا۔ تو آنریبل سر چھوٹو رام وزیر ترقیات پنجاب۔ آنریبل مسٹر منوہر لال وزیر مالیات پنجاب۔ آنریبل میاں عبدالحی وزیر تعلیمات پنجاب۔ آنریبل مسٹر سلیم ایڈووکیٹ جنرل پنجاب نے آگے بڑھ کر جنازے کو کندھا دیا۔

ہز ایکسیلنسی گورنر پنجاب کے سیکرٹری اور ایجنٹ نارتھ ویسٹرن ریلوے کے نمائندے نے گورنر پنجاب اور ایجنٹ نارتھ ویسٹرن ریلوے کی طرف سے مزار پر پھولوں کی چادر اور گلدستے چڑھائے۔

نماز جنازہ

شاہی مسجد میں مسلمانوں کی اس قدر کثرت تھی۔ کہ نماز جنازہ کے لئے صفیں درست کرنے میں ایک گھنٹہ صرف ہو گیا آٹھ بجے شب کو نماز جنازہ ادا کی گئی۔

اس کے بعد شاہی مسجد کے باہر مسجد سے ملحقہ باغ میں دنیائے اسلام کی جلیل المرتبت ہستی۔ اسمان سیاست کے درخشندہ آفتاب۔ اور دنیائے شعر و ادب کے ماہتاب کو پونے دس بجے رات کو آخری آرامگاہ میں ہمیشہ کے لئے لٹا دیا گیا۔

"احسان" ۲۴ اپریل ۳۸ء

آزل صاحب کی طرف سے ذیل کا مادۂ تاریخ وصول ہوا ہے۔ شکریہ کے ساتھ درج کیا جاتا ہے۔

شاعر ہندوستان حکیم اسلام

۱۳۵۷ھ

قطعہ

اقبال کا ایک قطعہ جو آخری وقت بحرِ طبع سے موتی بنکر نکلا

بہشتے بہرِ اربابِ ہمم ہست
بہشتے بہرِ پاکانِ حرم ہست
بگو با مسلمِ ہندی کہ خوش باش
بہشتے فی سبیل اللہ ہم ہست

دخل در معقولات کا جواب

پیر غلام دستگیر صاحب نامی کی ذات مستحق شکریہ ہے۔ آپ کی کوشش سے ذیل کا خط دستیاب ہوا ہے۔ نامی صاحب لکھتے ہیں۔

"۵ مئی ۱۹۳۸ء کو میں مشفقی عبدالمجید صاحب ازل کے ہاں مزنگ ملاقات کے لئے گیا۔ آجکل ہر صحبت میں علامہ سر اقبال مرحوم کے ذکر کے سوا اور کچھ مذکور نہیں ہوتا۔ ہم کئی گھنٹے تک اسی موضوع پر گفتگو کرتے رہے۔ جب میں واپس آنے لگا۔ تو حضرت ازل نے حضرت اقبال مرحوم کا ایک سیالکوٹ سے لکھا ہوا خط مورخہ یکم اکتوبر ۱۹۰۴ء جو انہیں ۱۳ اکتوبر کو شملہ ملا تھا۔ حوالہ کیا۔ یہ خط ازل صاحب کے دفتر کے ایک ہیڈ ڈرافسمین محمد قاسم کے خط کے جواب میں تھا۔ اور اقبال مرحوم کی اس نظم کے متعلق ہے۔ جو رسالہ مخزن بابت ستمبر ۱۹۰۴ء میں چھپی تھی۔ اور اب "بانگ درا" کے صفحہ پر بعنوان "سرگزشت آدم" درج ہے"

خط

بابو صاحب مکرم۔

یہ کوئی صاحب چھوٹے شملہ سے میری غزل

کی اصلاح کرکے ارسال کرتے ہیں۔ میری طرف سے ان کا شکریہ ادا کیجئے۔ اور عرض کیجئے۔ کہ بہتر ہوگا۔ اگر آپ امیر اور داغ وغیرہ کی اصلاح کیا کریں۔ مجھ گمنام کی اصلاح کرنے سے آپ کی شہرت نہ ہوگی۔ میرے بے گناہ اشعار کو جو حضرت نے اپنی تیغ قلم سے مجروح کیا ہے۔ اس کا صلہ الٰہیں خدا سے ملے! میں یہی دعا کرتا ہوں۔ کہ خدا اُن کو عقل و علم عطا کرے۔

میں نے یہ چند حروف محض ازراہِ ہمدردی تحریر کئے ہیں۔ امید کہ وہ بُرا نہ سمجھیں گے۔ اکثر انسانوں کو کنج تنہائی میں بیٹھے بیٹھے ہمہ دانی کا دھوکا ہو جاتا ہے۔ ان کا کوئی قصور نہیں ہے۔ فطرتِ انسانی ہی اس قسم کی ہے۔

راقم آثم
محمد اقبال

قطعہ تاریخ

از حضرت غلام دستگیر صاحب نامی

آہ آں اقبال با اقبال ما / آنکہ مارا داد درسِ آبرو
رفت خنداں و مرا گریاں گذشت / ساختیم از آبِ اشکِ خود وضو
شد نمازِ او ادا در بیتِ حق[1] / مشرقش[2] گردید پُر رونق ازو
ہر مصلّی کو سوئے مسجد رود / اول آں جامی شود اقبال جو
فاتحہ خواند بروحِ آں کہ بود / صاحبِ صدق و صفا و نیک خو
آنکہ زو رازِ خودی دریافتیم / بے خودی ہا عیاں شد کو بکو
حاصلِ ما گشت ازو سوز و گداز / شورشے انگیختیم از ہا و ہو
قلبِ او گنجینۂ اخلاص بود / زاں کسے بودش نہ در عالم عدو
رحمتِ حق بر مزارِ او نثار / رافتِ احمد انیسِ حالِ او

نامیا گو سالِ فوتش با ادب
گشت بے اقبال دہر از مرگِ او
۱۳۵۷ھ

۱؎ بادشاہی مسجد لاہور ۲؎ اقبال کا مزار مسجد کے مشرق کی طرف ہے

قانونِ وراثت

آئے دن کی خانہ جنگیوں نے اہلِ ہندوستان کو تلخ کامی کی زندگی کے سپرد کر دیا ہے۔ اور اس کا سبب صرف یہ ہے۔ کہ آئین وقوانین سے عوام ناواقف ہیں۔ اس مشکل کا حل صرف قانونِ وراثت کے مطالعہ سے ہو سکتا ہے۔ قانون وراثت ایک ایسی مبسوط، جامع اور مستند کتاب ہے جس میں ہر حیثیت کے ورثہ کو تقسیم وراثت کی ہدایات دی گئی ہیں۔ یہ ہدایات قانونِ شریعت (شیعہ وسنی) قانونِ رواج اور قانونِ اہل ہنود کے ماتحت ہیں۔ قانونِ ہبہ۔ وصیت۔ وقف اور وقف علی الاولاد کی بھی وضاحت کی گئی ہے اور تمثیلات بھی پیش کی گئی ہیں۔ قانونی حیثیت سے بعض بعض تحقیقی جوابات بھی درج ہیں۔ اس کتاب کے ہوتے ہوئے عدالتوں میں جانے کی ضرورت نہیں۔ کوئی رشتہ دار کسی رشتہ دار کا حق غصب نہیں کر سکتا۔ لیکن قانونِ وراثت کا مطالعہ شرط ہے۔ قانونِ وراثت کی حیثیت واضح کرنے کے لئے اتنا ہی کافی ہے۔ کہ وکیلوں بیرسٹروں ججوں نے اس کو اپنی بے لوث مگر قیمتی آراء سے مُزیّن کیا ہے۔ لکھائی چھپائی اور کاغذ دیدہ زیب ۲۰×۲۶/۸ حجم ۲۴۰ صفحات انداز تحریر دلکش اتنی خوبی کے باوجود قیمت قسم اول صرف عہ۔ قسم دوم عہ۔ محصولڈاک بذمہ خریدار۔ منگانے کا پتہ۔

مہتمم اشاعت ادب لاہور۔

فن شاعری عرف میزان العروض

یہ کتاب فن شاعری، عروض اور تمام معائب و محاسن شعری کا دلکش مرقع ہے۔ عروض کے تمام باریک سے باریک نکات پر ماہرانہ حیثیت سے روشنی ڈالی گئی ہے۔ بحور اور تقطیع کے کسی جزوی حصے کو بھی نظر انداز نہیں کیا گیا۔ تمام قواعد۔ اقسام نظم مع تمثیلات و تعریفات مکمل حیثیت میں پیش کئے گئے ہیں۔ عیوب و محاسن شعری پر مدلل بحث کی گئی ہے۔ اگر آپ استاد کی امداد سے بے نیاز ہو کر کامل و مکمل شاعر بننا چاہتے ہیں۔ تو "فن شاعری عرف میزان العروض" کا ضرور مطالعہ کریں۔ یہ کتاب نہایت عام فہم اور سلیس عبارت کی حامل ہے۔ انداز تحریر اتنا دلکش اور دلچسپ ہے۔ کہ ختم کئے بغیر چھوڑنے کو جی نہیں چاہتا۔ تھوڑی سی استعداد کا مبتدی بھی اس کے چند روزہ مطالعہ سے ایک کامل شاعر بن سکتا ہے۔ لکھائی چھپائی اور کاغذ دیدہ زیب۔ حجم ۴۰۰ صفحات سائز $\frac{20 \times 26}{8}$ ان تمام ظاہری و باطنی محاسن کے باوجود قیمت قسم اول دو روپے آٹھ آنہ (۲؍۸) قیمت قسم دوم ایک روپیہ آٹھ آنے (۱؍۸) محصولڈاک بذمہ خریدار

(منگانے کا پتہ)

مہتمم اشاعت ادب لاہور

حکایات اُردو مثنوی مولنا روم رح

Post Graduate Library
College of Arts & Commerce, O. U.

ترجمہ

مولنا پیر غلام دستگیر صاحب نامی

مولنا جلال الدین محمد رُومی کی مثنوی کی منظوم حکایات کا منثور اردو ترجمہ۔ جو زبان کے لحاظ سے اِس قدر بہترین اور سلیس و عام فہم ہے۔ کہ ادب شغف حضرات کے علاوہ کم استعداد بھی مثنوی کے حقائق و معارف سے بدرجۂ احسن لطف اندوز ہو سکتے ہیں۔ کتابت و طباعت عمدہ۔ کاغذ دبیز سرورق رنگین آرٹ پیپر۔ سائز ۲۰×۲۶ باوجود ان تمام ظاہری و باطنی محاسن کے قیمت صرف ایک روپیہ آٹھ آنے (عہ) محصولڈاک بذمہ خریدار۔

زوالِ ایران

ایران کی سلطنتِ مجوسیہ کے زوال اور سلطنت اسلامیہ کے عروج کی مفصل تاریخ قیمت صرف آٹھ آنے (۸) محصولڈاک بذمہ خریدار۔ منگانے کا پتہ۔

مہتمم اشاعت ادب لاہور

حجازی پریس بیرون موری گیٹ لاہور باہتمام حافظ محمد اسمٰعیل پرنٹر چھپا اور بابو نصیر الدین احمد پبلشر نے چھپوا کر دفتر اشاعت ادب سے شائع کیا

تاریخی، مذہبی اور ادبی

کتابیں

منگوانے کا پتہ:-

اشاعتِ ادب لاہور